سدرۃ المنتہیٰ
بند دروازہ
مکمل ناول

سدرۃ المنتہیٰ

سنگ دروازہ

مکمل ناول

کسی مضافاتی علاقے میں نہر کے قریب کسی بستی سے دور وہ لکڑی کی چھت والا ایک اکیلا گھر تھا اور خاصی اوپری سطح پر تھا کہ پکی سڑک پر سے گزرنے والے کی نگاہ سیدھی اس پہاڑ کی چھوٹی سی چوٹی پر پڑتی تھی۔ جب بھی سیلاب آتا اس گھر کی بنیادوں کو چھو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ نہر میں ارتعاش ضرور آتا اور پانی چوٹی سے ٹکراتا بھی تھا مگر تک نہ پاتا۔

بے ترتیب پتھروں کے درمیان پچھلی طرف کے بڑے سے پتھر کو کاٹ کر سیڑھی بنائی گئی تھی، جو اوپر والے کو نیچے اور نیچے والے کو اوپر تک جانے میں مدد دیتی تھی۔ اس سیڑھی کے اطراف میں بہت سے چھوٹے پتھر، کنکریاں بچھی ہوئی تھیں، سیڑھی کے نیچے زمین کچھ ہموار تھی۔

جہاں سے راہ گیر لڑکھڑاتے ہوئے پتھروں کو پھلانگ کر پکی سڑک تک جاتا تھا۔ اور پکی سڑک پر جب چھوٹی سی جیپ گزرتی تھی تو ابوذر کھڑکی سے سر نکال کر اس چھوٹی سی چوٹی پر بنائی گئی اپنی جنت کو دیکھتا تھا، جہاں پر اک کم عمر، خوب صورت حور اس کا

ریلنگ پر جھک کر انتظار کرتی تھی یا بے قراری سے ٹہلتی تھی۔

اس نے اب بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مگر جنت کی حور اپنی مخصوص جگہ پر نہیں تھی۔ گاڑی پکی سڑک سے نیچے اُترنے کو تیار نہ تھی۔ ڈرائیور نے ابوذر کو یہیں اُتر جانے کا کہہ دیا۔ یہ جیپ اس کے ساتھی دوست کی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتا' اس کی گاڑی لے آتا تھا۔ کبھی کبھار تو گاڑی کچھ دنوں کے لیے رکھ لیتا اور تب اس کی رانی اسے طعنے دیتی "ابوذر ایک چھوٹی سی جیپ بھی نہیں لے سکتے تم۔"

چونکہ پتھریلے اور ریتلے راستوں کے لیے جیپ کی سواری ہی بہترین تھی۔ علاوہ ازیں سواریاں زیادہ آگے جانے پر بری طرح متاثر ہو جاتی تھیں۔

وہ اپنی رانی کی بات بے تاثر چہرے سے سنتا یا پھر ایک قہقہہ لگاتا۔ وہ اسے گھورتی یا پھر مسکراہٹ دبا کر اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اس کے تصور میں جیپ سے اُترا۔ تھیلا کندھے پر لٹکایا اور پکی سڑک سے پتھریلی سڑک پر آگیا۔ جہاں سے پتھروں سے بچ کر نکلنا دشوار تھا۔

اس کی مضبوط لیدر کی چپلوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہمیشہ کی طرح چبھ گئیں۔ جن کی چبھن پاؤں تک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بڑے پتھروں سے بچتا بچاتا سیڑھی چڑھتے اوپر آیا جہاں چھوٹے سے مکان کے اوپر رکھی لکڑی کی چھت کچھ آگے تک نکلی ہوئی دھوپ سے بچا رہی تھی اور اسی کے نیچے مٹی کے گملے سجے ہوئے تھے' جن میں سارے پھول ابوذر کی پسند کے لگائے ہوئے تھے۔

بعض اوقات عائشہ اس کی رانی ان پھولوں کا گلدستہ بنا کر اسے پیش کرتے ہوئے خوش آمدید کہتی' ابھی اسے سامنے نہ پا کر وہ جھک کر سارے گملوں سے پھول توڑنے لگا اور پورا گلدستہ بنایا اور ہاتھ میں لیے ان کی خوشبو دل میں اُتارتا آگے بڑھا۔ وہ ریلنگ کے سہارے چل کر لاؤنج میں آیا وہ خالی تھا۔

آگے دو کمرے تھے اور کونے پر ایک جگہ میز رکھ کر دو کیبنٹ بنا کر کچن کا نام دیا گیا تھا۔

ابوذر نے اسے لکڑی کا ایک اسٹینڈ بھی بنا دیا تھا۔ جس پر گنتی کے چار' چھ برتن رکھے ہوئے تھے۔ چولہے پر ہنڈیا چڑھی تھی۔ تازہ سالن اتار آگیا تھا۔

اس کی پسند کا ساگ اور مچھلی کی خوشبو سارے میں پھیل رہی تھی۔ پرات ہٹا کر دیکھا تو چاول کے آٹے کے پیڑے بنائے گئے تھے۔ تازہ روٹی ڈالنے کے لیے۔

وہ اس کی آمد سے لاتعلق نہ تھی۔ ابوذر نے جو ایک ہفتہ پہلے اسے فون پر کہا تھا کہ وہ اگلے ہفتے آئے گا۔ اتوار یا پیر کو اور آج منگل تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اتوار سے یہ اہتمام کرتی آئی ہوگی۔

اور شاید یہ دیر سے آنے پر ناراضی کا اظہار ہے کہ آج نہ وہ ریلنگ پر جھکی ہاتھ ہلاتی ہوئی نظر آئی' نہ پھولوں کے گملے کے پاس' نہ ہی لاؤنج میں کچن میں سالن بھونتی ہوئی ملی' وہ کمرے میں ہی تھی۔

ابوذر بغیر اسے آواز دیے ــــ آہستگی سے قدم اٹھاتا اندر آیا' جس طرف عائشہ کی پشت تھی۔ اس نے بیگ اتار کر رکھا اور ہلکے سے عائشہ کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

"بتاؤ تو کون آیا ہے۔" یہ شرارتی انداز عموماً عائشہ کا ہوتا تھا اور وہ اسے منانے کے لیے اسی کے حربے استعمال کر رہا تھا۔

عائشہ نے بے دردی سے ہاتھ ہٹائے اور اس نے پھولوں کا گلدستہ آگے کر دیا اس کے' جو لے کر اس نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا موڈ بہت خراب تھا۔

"یہ ناراضی کا اظہار ہے۔" وہ اس کے آگے آکھڑا ہوا۔

"آج کون سا دن ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

"میں تاریخ نہیں دیکھتا۔ میرے کیمپ میں کیلنڈر ہی نہیں ہوتا۔" اس نے کندھے اُچکائے بڑے مزے

سے 'یہ تو سچ تھا کہ کیمپ میں کیلنڈر نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ پرائیویٹ گیس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ جہاں اسے پہاڑی علاقے میں یا پھر کئی جگہوں پر عارضی کیمپ میں رہنا پڑتا تھا۔ کیمپ کے اندر ہر سہولت تھی۔ یہاں تک کہ ٹی وی بھی رکھا گیا تھا۔ جو صرف اینٹینا کے ذریعے سرکاری چینل ہی دکھاتا تھا۔

اتنی سہولیات کے باوجود کیلنڈر لگانے کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ ٹی وی چینلز' موبائل فون ۔ ہر جگہ کیلنڈر کا اندراج نصب تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ تاریخ بھی بتا دیتا تھا۔

عائشہ کے ذہن میں نہ آیا کہ جیب میں پڑا سیل فون اٹھا کر اسے تاریخ دکھادے۔ وہ صرف اسے خفگی سے گھورتی رہی۔

"میرا کیا قصور ہے کہ پچھلے تین دن سے میں مچھلی اور ساگ پر گزارا کر رہی ہوں۔" اس کی شکایت بجا تھی۔

"تم اپنے لیے کچھ اور بنا لیا کرو۔" وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح پتا تھا وہ ایک وقت میں کئی چیزیں نہیں بنائے گی۔ اسے یہ سب وقت' پیسے اور چیز کا ضیاع لگتا ہے۔

وقت تو ہاتھ سے کھسک جاتا ہے' مگر وہ چیزوں کو اور پیسے کو بچا کر رکھتی تھی۔ اس کی یہ عادت بہت اچھی تھی۔ جس نے ابوذر کو فائدے میں ڈالا ہوا تھا۔

"اچھا کھانا لاؤ' بہت بھوک لگی ہے۔" وہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا اور کمرے سے ملحق باتھ روم کا رخ کیا۔

وہ کھانا لینے کچن میں پہنچی اور گرم گرم روٹی ڈالنے لگی۔ ابوذر کو تازہ روٹی پسند تھی۔ ساتھ ہی اسے اس بچی کا خیال آیا جو پچھلے کئی دنوں سے بخار میں تپ رہی تھی اور کھانے کے نام پر اب تک صرف چند نوالے لیے تھے۔

وہ کھانے کی ٹرے لیے اپنے کمرے میں آئی' جہاں ابوذر فریش ہو کر بیٹھا تھا۔ کھانے کے انتظار میں پانی پر گزارا کر رہا تھا۔ پہلے پانی پی لیتا پھر آدھی روٹی کھا کر آدھی بچا کر ضائع کرتا۔ اسے ابوذر کی یہ عادت سخت ناپسند تھی کہ وہ کھانے سے پہلے پانی بہت پیتا تھا۔

اس نے بغیر کچھ کہے کھانے کی ٹرے قریب کی اور نوالہ لیتے ہوئے اسے خیال آیا۔

"وہ کہاں ہے؟" اس کا اشارہ بچی کی طرف تھا۔

"اس نے کھانا کھایا۔" یہ دوسرا سوال تھا جس پر عائشہ کا موڈ مزید خراب ہوا تھا۔

"یہ پوچھا کہ میں نے کھانا کھایا یا نہیں' تم پہلے اس کا پوچھ رہے ہو۔" ناراضی بجا تھی۔

"اس لیے کہ وہ چھوٹی سی بچی ہے۔" نوالہ ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔

"دے دوں گی اسے' تم کھالو پہلے۔" لہجہ روکھا سا تھا۔

"پہلے اسے دے دو.... میں بعد میں کھالوں گا۔" نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

"نہیں کھاتی تمہاری لاڈلی یہ مچھلی اور ساگ۔ کہتی ہے بو آتی ہے۔ سخت ناپسند ہے۔ اب میں کہاں سے لاؤں اس کے لیے الگ سے کھانا۔"

"وہ بچی ہے' اس کے لیے کچھ بنا دیا کرو عاشی!"

نوالہ حلق میں اُترنے کے لیے ترس رہا تھا اور وہ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"جب میں اپنے لیے نہیں بناتی تو اس کے لیے کیوں بناؤں۔"

"بہت بری بات ہے عاشی! کہاں ہے وہ ابھی۔" وہ اٹھا اور بیگ میں سے ایک ڈبا نکالا۔ جس میں چاکلیٹ اور بسکٹ کے ساتھ کچھ اور چیزیں تھیں۔ ڈبا لیے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے کی طرف آیا جہاں پر غیر ضروری اور ضروری سامان بھرا تھا۔ کونے میں ایک بستر بچھا تھا جس پر وہ سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔

"کہاں رکھا ہوا ہے تم نے اسے۔ اپنے ساتھ سلانے میں کیا حرج تھا۔" پیچھے سے آتی عائشہ کو اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"بیٹا! کیا حال ہے۔" وہ گھٹنے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سر اٹھایا تو رنگت سرخ تھی اور آنکھیں جیسے دہکتا ہوا انگارہ۔ ابوذر نے ہاتھ بڑھا کر پیشانی چھوئی تو چیخ اٹھا۔

"اتنا تیز بخار... بتایا بھی نہیں تم نے مجھے۔" اس کا غصہ عائشہ پر تھا جو ابھی تک غصہ دبا رہی تھی اپنا۔

"اٹھو بیٹا... جلدی اٹھو۔" اس نے بچی کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ جو فوراً بدک کر پیچھے ہوئی کرنٹ کھا کر۔ "مجھے نہیں جانا کہیں، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔"

"میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔ اگر تم میری بات مانو گی۔"

"نہیں مانوں گی۔" سہمے ہوئے لہجے میں کیا نہیں تھا۔ ابوذر کو ٹوٹ کر پیار آگیا۔ اس نے بچی کا سر چوم لیا۔

"پہلے ہم کھانا کھائیں گے، پھر ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، پھر میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔"

"پہلے مجھے گھر چھوڑ دیں۔" ملتجی انداز، معصوم چہرہ وہ مسکرایا۔

"پہلے کھانا۔"

"کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" برا سا منہ بنایا۔

"تو پھر بسکٹ کھالو یا چاکلیٹ۔ دیکھو اس میں کتنی چیزیں ہیں۔"

پیکٹ کھول کر دکھایا، رنگ برنگے ریپرز میں چھپی جیلی، چاکلیٹ، ٹافیاں، بسکٹ اس کے سامنے تھے۔ عائشہ خاموش تماشائی سی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لایا کرتا تھا۔ اس بار بھول گیا یا ضروری نہ سمجھا۔ "نہیں، مجھے گھر جانا ہے۔" چہرہ اترا ہوا افسردہ سا تھا۔

"چلو، ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس چلیں پھر گھر جائیں گے۔" اس کی شکل روتی سی بن گئی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور ملایا۔

"ہاں اختر کہاں ہو۔ ابھی اسی ایریا میں ہو نا۔ یار! یہیں رکنا، بلکہ کچھ آگے تک آؤ، بہت ضروری کام ہے۔ بچی بہت بیمار ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ ہاں میری بچی۔"

عائشہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

ابوذر نے چیزیں سمیٹ کر کچھ اپنی جیبوں میں بھری اور اسے اٹھا لیا۔

"میں خود چل سکتی ہوں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"نیچے جا کر اتر جانا۔ یہاں سے رستہ مشکل ہے۔" وہ فون جیب میں ڈالے اسے کندھے پر اٹھائے تیزی سے باہر آیا۔

"مجھے واپسی میں دیر ہو سکتی ہے، کھانا کھا لینا۔ دیر ہو جائے تو سو جانا، میں آجاؤں گا۔" وہ عائشہ سے کہتے ہوئے نیچے کی طرف آیا۔ پاؤں سیڑھی پر رکھ دیے۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ آپ مجھے گرا دیں گے۔" وہ چیخی۔

"نہیں گرو گی۔ چپ رہو۔" اس نے تیزی سے اترتے ہوئے ڈانٹا۔ اس نے اپنی چیخ دباتے ہوئے زور سے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ نیچے اتر کر پکی سڑک کی طرف جا رہا تھا، جہاں سے دور سے آتی ہوئی جیپ دکھائی دے رہی تھی۔ عائشہ ریلنگ کے پاس کھڑی عجیب سے انداز میں ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ کھانا دیر تک ایسے ہی پڑا رہا اور وہ نوالہ

بھی۔

☼ ☼ ☼

شام پھیل رہی تھی۔ موسم میں سردی کی شدت بھی کچھ بڑھی تھی۔ سردی کی شدت سے اس کا چہرہ پورا سرخ تھا اور ناک تو جیسے لال ہو گئی تھی۔ فلو کا اثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اسے پتا تھا' اب طبیعت بگڑنے لگی ہے۔ اب بگڑے گی تو سنبھلنے کا نام نہ لے گی۔ اس کا السر پک کر لاوا بن گیا تھا۔ اندر گرمی کی شدید لہر تھی اور باہر جسم تھر تھراتا تھا' مگر وہ ہر کیفیت سے لاپروا' بے زار اور بے چین گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ اسے فکر تھی' بچے اکیلے اور ——— پریشان ہوں گے۔ دوسری طرف اسے زینی کی فکر کھا رہی تھی۔ چہرے پر سوچ کے آثار تھے۔ وہ تھکے قدموں سے تھیلا ہاتھ میں لیے گھر آئی۔

یہ قدرے ویران علاقہ تھا۔ چھوٹی سی بستی تھی اور چند گھروں کے بیچ فاصلہ بہت زیادہ۔ بیچ میں کئی پلاٹ خالی تھے اور کچھ زیر تعمیر ایک دم اجنبی ماحول۔ نہ کوئی جاننے والا' نہ پوچھنے والا۔ ایسے میں بچوں کو اکیلا چھوڑنا بہت مشکل تھا۔

مگر زینی کی جدائی نے اسے ——— ختم کر دیا تھا۔ جیسے ایک بے چین تلاش تھی۔ وہ ہر روز اس جگہ جاتی۔ ٹھہرتی' بیٹھتی' انتظار کرتی' پھر آجاتی۔

پاگلوں کی سی کیفیت ہو گئی تھی' بچوں کی الگ شکایت ہوتی کہ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں' فاطمہ روتی اور شانی خاموش آنسو بہاتا رہتا۔

وہ ماں تھی۔ کلیجہ پھٹنے لگتا۔ کھانا پینا تو ویسے ہی حرام ہو گیا تھا۔ بچوں کا سوچ کر قدم اور تیز ہو گئے تھے۔ گاڑی گھر سے کافی دور رکوائی تھی۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر آگے بڑھی۔ فاطمہ اور شانی کب سے کھڑکی سے لگے کھڑے تھے' انہیں انتظار کرتے ہوئے بھی ڈھائی' تین گھنٹے ہو گئے تھے۔

آگے روشنی کم تھی۔ پتھر بچھے ہوئے تھے۔ رستے میں وہ بچتی بچاتی دروازے تک آئی۔ لکڑی کا دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا۔ ایک دھکے سے ہی۔ اسے صحن میں دیکھ کر شانی دروازے سے باہر نکلا' پیچھے فاطمہ بھی تھی۔

"کہاں تھیں آپ؟ اتنی دیر ہو گئی۔ کیوں ہمیں چھوڑ جاتی ہیں۔" فاطمہ لپٹ کر رونے لگی اور شانی کے چہرے پر شکایت لکھی تھی۔

"اندر چلو۔" وہ آنسو پیتی ان کو ساتھ لپٹائے اندر آئی۔

"میرے بچے تو بہت بہادر ہیں نا۔" اس نے شانی کی پشت تھپکی' گال پر پیار کیا ——— فاطمہ تو اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اندر آکر اس نے بچوں کو الگ کیا۔ تھیلا کھولا' راشن بکھر گیا۔

چھوٹے چھوٹے سا شے' پیکٹ' صابن' شیمپو' پتی' چینی' آٹا' چاول وغیرہ زینی کو میکرونی اچھے لگتے تھے۔ فاطمہ ہاتھ میں پیکٹ لے کر بیٹھ گئی۔

"اب کیوں لائی ہیں امی! جب زینی نے ضد کی تھی' تب تو نہیں لائی تھیں۔" فاطمہ کا موڈ بہت خراب تھا۔

"زینی جب آئے گی' تب ہم یہ بنائیں گے یہ رکھ لو فاطمہ۔" شانی نے پیکٹ لے لیا۔ اس کا لہجہ عجیب سا تھا دکھ بھرا۔ یقین اور بے یقینی کے درمیان ٹھہرا۔

"تم یہ کھالو۔ زینی آئے گی تو ہم بہت سارے میکرونی لائیں گے۔ ہم آئس کریم بھی روز کھایا کریں گے۔ ہم روز آؤٹنگ کے لیے جائیں گے۔ میں بالکل بچت نہیں کروں گی۔ (بچت بہہ جاتی ہے)" اس کی مسکراہٹ جھوٹی تھی' مصنوعی تھی' مگر لہجے میں امید تھی۔

"چاہے جتنی سردیاں ہوں ... ہم آئس کریم کھائیں گے؟" فاطمہ بھی دل کو بہلانے کا کام کرتی تھی۔

"چاہے سردی ہو۔" وہ مسکرائی' پھر وہی مسکراہٹ۔

"زینی مل جائے گی نا امی؟" شانی بھی جب سوچ سوچ

کر تھک جاتا تو بولنے لگتا۔

"کل ___ تم لوگ پھر سے اسکول جاؤ گے۔ بہت ہو گئیں چھٹیاں۔"

"زینی کے بغیر کون اسکول جائے گا امی!" فاطمہ کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا۔

"ہم اسکول جائیں گے فاطمہ ..... !" شانی کا بڑا پن عود کر آیا تھا۔ "زینی بہت جلد مل جائے گی۔ وہ بہت ذہین ہے' اسے بہت ساری چیزوں کا پتا ہے۔ وہ پہنچ جائے گی کسی طرح۔" نہ جانے وہ کسے بہلا رہی تھی۔

"کیسے پہنچے گی۔ وہ بہت چھوٹی ہے امی۔ اسے رستوں کا نہیں پتا' پھر نئے گھر کا اسے کیسے پتا لگے گا۔ ہمارے پاس فون نہیں' نہ پرانا نمبر' وہ کیسے رابطہ کرے گی ہم سے۔" فاطمہ کی آواز رندھ گئی۔ وہ پھر سے رونے لگی تھی شاید۔

اس نے گیلی آنکھوں سے فاطمہ کا چہرہ دھندلایا ہوا دیکھا تھا۔ دل جو ڈوبا ہوا تھا۔ رک سا گیا۔

"ہم سب کے بغیر رہ سکتے ہیں۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ ہم بابا کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں۔" شانی بولتے بولتے رک گیا۔

"بابا کو زینی کا بتائیں۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ وہ زینی سے تو محبت کرتے ہیں ناامی۔" فاطمہ کو جیسے کوئی جلتی بجھتی امید کی بتی ہاتھ لگی تھی۔

وہ چپ ہو گئی' فاطمہ کے چہرے پر امید کا سایہ دیکھ کر کچھ نہ بول سکی۔

"وہ ہمارا فون نہیں اٹھاتے۔ ان کو نمبر بدلنے کی عادت ہے۔"

"ہو سکتا ہے نمبر بدل لیا ہو۔ اگر نہ بھی بدلا ہو تو ان کی بیوی فون اٹھاتی ہو اور وہ رانگ نمبر کہہ کر فون رکھ دیتی ہو....."

شانی کی شکایتیں بھی ٹھیک' خدشے بھی درست۔ فاطمہ کی امید کی بتی بجھنے لگی جیسے۔

"سارا آنٹی اور انکل سفیر آنے والے ہوں گے آج یا کل میں پہنچ جائیں گے۔ وہ لوگ ہماری مدد کریں گے۔"

"اور ہمیں زینی ضرور مل جائے گی۔ ان شاء اللہ کہو فاطمہ۔" شانی نے امید کی بتی کی لو بڑھا دی۔ ان شاء اللہ کہہ اور کھلواکر۔

وہ دونوں سامان کے تھیلے اٹھا اٹھا کر کچن کی طرف لے جا رہے تھے اور کیبنٹ میں سیٹ کر رہے تھے۔ وہ ان کی ماں تھی جو انہیں دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

✵ ✵ ✵

یہ وہی جگہ تھی اس کا گھر' اس کا اجڑا ہوا گھر جو ڈھے گیا تھا۔ اسے اب بھی وہ خوف ناک شب یاد آ کر ڈراتی تھی جب اس کی نانی اس سے بچھڑی تھی۔ جب اسے غلطی سے کسی اور کشتی میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھی۔

ایک ماہ سیلاب زدگان کے کیمپ میں رہ کر اس کا برا حال ہو گیا تھا۔

تب ہی اسے ابوذر جیسا فرشتہ ملا تھا جو اٹھا کر اس بچی کو اپنے پہاڑی ایریا والے گھر لے آیا تھا۔ اسے ابوذر کے گھر میں لگ بھگ دو ماہ ہو گئے تھے۔

ابوذر پندرہ دن گھر سے باہر ڈیوٹی پر ہوتا' پھر کچھ دن آتا اور چلا جاتا۔ پچھلا پورا مہینہ وہ نہیں آسکا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے وہ دوسری بار گھر آیا تھا۔

اور اس بار ایک ہفتے کی چھٹی پر آیا تھا۔ اس کے کہنے پر وہ اسے لے تو آیا تھا' مگر پچھتا رہا تھا۔ ڈوبا ہوا مکان ڈھے چکا تھا بری طرح سے۔ اب پانی کافی اتر گیا تھا۔ علاقہ خشک ہو گیا تھا کافی' مگر مکان رہنے کے قابل نہ بچے تھے۔

یہ بستی نچلی سطح پر تھی۔ سارے مکان ڈوب گئے تھے اور ان کے مکان کی تو دیواریں بھی ڈھے گئی تھیں۔ زینی اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر اس کے ساتھ بیٹھی بھاں بھاں کر کے روتی رہی۔ اسے چپ کرانا مشکل ہو رہا تھا۔

"بس بہت ہو گیا اٹھو اب۔ اتنی ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ ابھی تو انجیکشن لگے ہیں بخار کے' ڈاکٹر نے منع کیا ہے سردی میں باہر نکلنے سے۔"

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے نہیں جانا۔"
اس کے رونے میں کمی واقع ہوئی تھی۔ درحقیقت وہ روتے روتے تھک گئی تھی۔ اب رویا بھی نہیں جارہا تھا۔
"ہم یہاں پھر آجائیں گے۔ ابھی یہاں کوئی نہیں ہے۔ ہم تمہاری امی کو ڈھونڈلیں گے۔ تم ابھی چلو۔"
اس نے اسے کندھے پر اٹھالیا۔
"یہاں پریاں آتی ہیں۔" وہ اس کی پشت پر چمٹی تھی اور چھوٹی سی بانہیں اس کی گردن میں لپٹی تھیں۔
"ایسی کھنڈر جگہ پر پریاں نہیں آتیں۔" وہ ہنسا تھا۔
"آپ کو پریوں کی کہانی آتی ہے؟"
"مجھے بہت ساری کہانیاں آتی ہیں۔" وہ اسے پشت پر اٹھائے بڑے مزے سے آگے بڑھ رہا تھا۔
جیپ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس نے فون کرکے دوست سے کچھ دنوں کے لیے گاڑی رکھنے کی بات کرلی تھی۔ ڈرائیور جاچکا تھا۔
اس نے دروازہ کھول کر اسے بٹھایا اور دوسری طرف آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ اس کی جیکٹ میں پوری پیک بیٹھی تھی۔ صرف گردن اور سر باہر تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کو اس نے ٹوپی سے ڈھانپ لیا تھا اور اب ریپر اتار کر چاکلیٹ کھا رہی تھی۔
"کہانی سنائیں نا۔"
"کہانی یہ ہے کہ ایک جگہ ایک پری رہتی تھی۔"
وہ یاد کرنے لگا کہ آگے کیا کہنا ہے۔
"یہ کہانی مزے کی نہیں ہے' دوسری سنائیں۔"
"تمہیں پتا ہے میری بھی ایک بیٹی ہے۔ بالکل تمہاری طرح' تمہارے جیسی.... پیاری سی.... چھوٹی سی۔" اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ محبت تھی اور اندر چھپا ہوا دکھ' جو وہی سمجھ پاتا تھا۔ اس چھوٹی سی بچی کو تو صرف اپنی جیسی پری کی کہانی سے مطلب تھا۔
وہ بڑی توجہ سے ریپرز جیکٹ کی جیب میں اڑس کر اس کی طرف دیکھ کر سن رہی تھی۔ کہانی خود بخود بنتی جارہی تھی۔ کہانی سناتے ہوئے ابوذر جیسا چٹان سا آدمی نرم ہوگیا تھا۔
لہجہ سمندر کی گہرائی لیے تھا۔ جس میں اس کا من ڈبکیاں لگا رہا تھا۔
وہ زینی کے سوالوں پر مسکرا رہا تھا اور آنکھوں کی نمی بھی صاف کررہا تھا۔
اسکرین جانے کیوں دھندلی لگنے لگی تھی۔ حالانکہ اس نے مضبوطی سے اسٹیرنگ تھام رکھا تھا۔ پہاڑی علاقے کی طرف جانے والی سڑک آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابوذر ننھی پری کو یوں ہی اٹھائے اٹھائے آیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے میں رات بہت ہوگئی تھی۔ یہاں سے شہر تک وہ ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو ہوتی تھی۔
اور پھر زینی کے گھر تک اور لمبا سفر... وہ ایک الگ ہی شہر تھا اور یہ پہاڑی علاقہ خاصا دور تھا۔ اسے پہنچتے پہنچتے رات کے ڈھائی بج گئے تھے۔
زینی سوئی ہوئی تھی۔ وہ اسے لاؤنج والے صوفے پر لٹا کر اس کے اوپر بڑا سا کمبل ڈال کر اپنے کمرے میں آیا' تو اسے جاگتا ہوا پایا۔
"کیسی ہو یقیناً" ویسی ہی' جیسی صبح تھیں۔"
اس کو خاموش پاکر وہ مسکرا کر بولا تھا اور پھر کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو جوں کی توں بیٹھی تھی۔
"کھانا کھالیا؟" وہ اس سے کچھ فاصلے پر لیٹ گیا۔ وہ خاموش تھی۔
"کچھ پوچھا ہے میں نے۔"
"کھالیتا... اگر نہیں کھایا ہوتا؟"
"تو اپنے ساتھ زیادتی کرتیں۔ اتنی دیر بھوکی بیٹھ کر۔"
وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سوتا بنا اور وہ خونخوار نظروں سے دیکھتی رخ بدل کر لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ اٹھا تو زینی اٹھ گئی تھی۔ وہ چائے کا کپ لیے

اس کے پاس آیا۔
"بسکٹ کھانے ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔
"پھر کیا کھانا ہے؟"
"کچھ نہیں۔۔۔" اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔
"کیا ہوا ہے؟ کیا آنٹی نے ڈانٹا ہے؟" اس نے عائشہ کی طرف اشارہ کیا' زینی نے بڑی معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔
وہ اٹھا اور کچن کی طرف آیا۔
"تم نے اسے ڈانٹا ہے' ایک بچی کو۔"
"اس بچی نے میری زندگی حرام کردی ہے پچھلے دو ماہ سے۔"
"اس بچی نے تمہاری زندگی حرام کردی ہے پچھلے دو ماہ سے؟" اس نے تعجب سے اس کی بات دہرائی۔
"ہاں۔۔۔ تم آخر مان کیوں نہیں جاتے کہ یہ تمہاری بیٹی ہے اور تم اسے یہاں لے آئے ہو۔" وہ زور سے چیخی۔
"یہ میری بیٹی نہیں ہے مگر بیٹی جیسی ضرور ہے عائشہ۔" وہ بے بسی سے بولا۔
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مسلسل جھوٹ بول رہے ہو مجھ سے۔ تم نے کہا تھا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔ اپنی پوری فیملی کو بھول جاؤ گے۔ تم پوری زندگی ان کا ذکر نہیں کرو گے۔ مگر تم اپنی بیٹی کو لے آئے اور اب خدمتیں کروا رہے ہو مجھ سے۔" وہ روہانسی ہوگئی بولتے ہوئے۔
"دیکھو۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے' نہ میں یاد رکھنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو' وہ سب سچ ہے جو میں نے بتایا تھا۔ سیلاب میں یہ بچی۔۔۔"
"بس کرو ابوذر! بہت جھوٹ ہوگیا۔" اس نے تیزی سے بات کاٹ دی اس کی۔
"تم مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو۔" وہ اس کی طرح چیخ نہیں پایا۔ دکھ لہجے میں در آیا تھا۔
"ہاں۔۔۔ تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ تم اپنی بیوی سے بھی ملتے رہے ہوگے۔ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں ہے۔ پچھلے دو ماہ سے تم اس بچی کو اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو۔"
"تم ایک معصوم بچی سے حسد کررہی ہو۔ تم ہوش میں ہو؟" اب بات کاٹنے کی باری ابوذر کی تھی۔
"مجھے ہر اس چیز سے حسد ہے' جو تمہاری زندگی میں میری جگہ لے سکتی ہے۔ جو تمہیں مجھ سے دور کرسکتی ہے۔"
"تم غلط فہمی کا شکار ہو ایک معصوم بچی سے تم خود کو کمپیئر کررہی ہو۔"
"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کررہی ہوں کمپیئر' کیونکہ یہ معصوم بچی میرا وقت' میری جگہ لے رہی ہے۔"
"تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی بات کرتے ہوئے۔" اس کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رکا تھا۔
"اب تم اس کی وجہ سے مجھے مارو گے۔" وہ اور زور سے چیخی۔ آواز پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹی تھی۔
زینی حواس باختہ ہوکر اٹھی تھی۔ ایسے لڑتے تو اس نے اپنے ماں' باپ کو بھی نہیں دیکھا تھا۔
ان دونوں کی آوازیں تیز ہوگئی تھیں۔ زینی خوف زدہ ہوکر سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور وہیں سے اس کا پیر پھسلا تھا۔
"زینی۔۔۔ رکو۔" وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے گرتے دیکھ کر جیسے جان نکل گئی تھی۔
"اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے چیخ کر اس سے بولا جو خونخوار تاثرات لیے کھڑی تھی۔ رانی نے ڈائن کا روپ بدل لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح کا پہلا پہر تھا۔ اس کی آنکھ لگی ہی نہیں تو بیداری کیسی۔ بلکہ آنکھ اب لگنے کو تھی۔ مگر بوجھل دماغ نے جتنا سونے کی رٹ لگائی ہوئی تھی دل اتنا ہی پریشان تھا۔ بچے سوئے ہوئے تھے۔
وہ بڑی آہستگی سے اٹھی تھی کہ معمولی سی کھٹکے سے بھی وہ اٹھ جاتے۔ وہ زینی تھی جس کے سامنے بین بجانی پڑتی تھی۔ شور کرنا ہوتا تھا۔ کھینچا تانی ہوتی تھی۔

وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے باہر آئی اور صحن میں اترتی سیڑھیوں کے چار زینوں کے اوپر بیٹھ گئی۔ دھوپ کا نام ونشان تک نہ تھا۔

اسے یاد آیا زینی کو سردیوں کی دھوپ کتنی اچھی لگتی تھی اور گرمیوں کی دھوپ سے اتنی ہی چڑ ہوتی تھی اسے۔ پھر اسکول جانے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ ماضی قریب کے منظر کھٹا کھٹ سامنے آنے لگے۔

☆ ☆ ☆

یہ صبح بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے سارے کام دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ ایک کروٹ دائیں لی اور دوسری بائیں۔ پھر کھڑکی کی درزوں کو چیرتی روشنی کی لکیر کو دیکھا اور زوردار جمائی کے ساتھ بستر چھوڑ کر سامنے گھڑی پر نظر ڈالی۔

فجر کے بعد بمشکل چند منٹ ہی آنکھ لگتی تھی اور پھر اس کمرے میں آنے والی روشنی کی پہلی لکیر ہی جگا دیتی۔ وہ لحاف ہٹا کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

کھڑکی کا پٹ کھولتے ہی سورج کی کرنیں اندر داخل ہوئی تھیں۔

"شانی' فاطمہ' زینی! اٹھو شاباش جلدی اٹھو بچے۔" شانی تو اس کی پہلی آواز پر ہی جاگ جاتا تھا۔

حسب معمول وہ اٹھا اور آنکھیں ملتے ہوئے واش روم کی راہ لی۔ فاطمہ بھی اٹھ چکی تھی۔

مگر زینی کا آسانی سے اٹھنا محال تھا۔ اس پر چیخنے چلانے کا اثر کم ہی ہوتا تھا اور اس نے روز والی ترکیب آزماتے ہوئے اس کے اوپر پڑا کمبل تیزی سے کھینچا تھا۔

"ممی۔ کیا ہے۔ کتنی بار کہا ہے' کسی کے اوپر سے اس طرح کمبل نہیں کھینچتے۔" وہ روز کی طرح چیخی تھی۔ سبق پڑھنا تو ناپسند' مگر پڑھانا وہ خوب جانتی تھی۔

"ٹھیک ہے تو پھر سوتی رہو۔ لیٹ ہونے پر ٹیچر ہی تمہیں پوچھے گی۔"

"اور آج بازار بھی میرے ساتھ فاطمہ ہی جائے گی۔" دھمکی اثر کر گئی وہ چھلانگ مار کر نیچے اُتری۔

"چھٹی پر مارکیٹ لے جائیں گی؟" واش روم کی طرف جاتے ہوئے ایک بار پھر یقین دہانی چاہی' تاکہ پروگرام ملتوی کرے۔

"کیوں... کیا رات وعدہ نہیں کیا تھا۔" وہ کمبل تہ کر کے رکھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو ہر روز کرتی ہیں۔"

"وعدے اور بات میں فرق ہوتا ہے نا اور جب وعدہ کیا ہے تو لے ہی جاؤں گی۔"

"آپ نے کہا تھا کہ مسلمان کی زبان بھی وعدہ ہوتی ہے۔" "جو کہو وہ کر دکھاؤ۔"

"اچھا بابا! اب تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" وہ جاتے جاتے با آواز بلند بولی اور کچن میں آ گئی۔ رات والا آٹا فریج میں گوندھ کر رکھا تھا۔ وہ نکالا۔ جب تک شانی آ چکا تھا وہ آملیٹ کا آمیزہ تیار کرنے لگا۔ فاطمہ برتن نکالنے لگی۔ جب تک اس نے روٹیاں ڈالیں' فاطمہ اور شانی نے آملیٹ تیار کر لیے تھے۔ ایک ہاف فرائی انڈہ سادہ چپاتی نانی کے آگے رکھ آئے۔

"روز یہ چپاتی جس پہ ایک قطرہ تیل نہیں ڈالتے تم لوگ۔ روز یہ بنا نمک مرچ کے انڈہ' وہ بھی کچا۔ تنگ آ گئی ہوں کھاتے کھاتے۔" روز کی طرح چیخنا بھی ان کی ڈیوٹی تھا۔

"کیا ہے اماں۔ کھا لیا کریں کبھی شکر کر کے بھی۔ ڈاکٹر نے سخت پرہیز کو کہا ہے' یہ بھی میں دیتی ہوں کہ اس سے زیادہ کیا پرہیز ہو گا۔ آپ کو خوش کرنا تو بڑا مشکل ہے۔" پسینہ صاف کرتی روٹیاں لے کر کچن سے باہر آئی اور زینی کو پھر آواز دی۔

"کہاں رہ گئی ہو زینی۔ سو تو نہیں گئیں۔ آ جاؤ بیٹا شاباش... دیر ہو جائے۔" کمرے میں جا کر اب وہ اپنے کپڑے نکالنے لگی جو رات میں استری کر کے رکھے تھے۔ "آ بھی جاؤ بی بی۔" دروازہ بار بار بجانا پڑتا تھا۔

"کتنی بار کہا ہے دروازہ نہ بجایا کریں۔" وہ بڑبڑاتی واش روم سے باہر آئی۔

"بہت ہو گیا' استادی مت جھاڑو زیادہ اپنی۔" کھینچ

کر اسے قریب کیا بال بنائے، لوشن لگایا، بیگ چیک کیا اور اسے باہر لے آئی۔

"جلدی جلدی ناشتا کرلو، اس سے پہلے اسکول کی وین آجائے۔"

"بچوں کو سانس تو لینے دیا کرو ہاجرہ! ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے۔" نانی بڑے بڑے منہ بنا کر نوالے لیتے بڑبڑائیں۔

"سانس تو لے لیا کرو۔ کبھی اس طرح بھی کہہ دیا کریں اماں۔ بچوں کی فکر بہت رہتی ہے آپ کو، اپنی بچی کی فکر ذرا نہیں۔" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے چائے بنانے لگی۔

"ساری زندگی تو تیری فکر کرتے گزر گئی میری۔"

"رہنے دیں اماں۔" اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"قہوہ نہ دینا مجھے خدا کے لیے۔ سیدھی سیدھی اچھی بھلی چائے بنا کر دے دے۔"

اسکول کی وین آگئی تھی۔ شانی اور فاطمہ کھڑے ہوگئے۔ "زینی جلدی کرو، بچے گاڑی نہیں رکے گی زیادہ دیر۔" وہ وہیں سے چیخی۔ "ارے آج نہ بھیج بچوں کو اسکول ہاجرہ! دیکھ موسم بدل رہا ہے۔ بارش ہوگئی تو۔"

"نہیں نانی! میں دعا کروں گی اللہ سے کہ بارش نہ ہو۔" زینی وہیں سے چیخی۔

"اوں ہوں.... زینی بیٹا دعا کر کے اللہ کی رحمت کو نہیں روکتے۔"

"مگر مجھے آج مارکیٹ جانا ہے۔" کہتے ہوئے پانی کا گلاس منہ سے لگالیا۔

وہ بچوں کو دروازے تک چھوڑ آئی۔

"زینی کا خیال رکھنا۔" وین جب تک نظر سے اوجھل نہ ہوتی تب تک وہ وہیں کھڑی رہتی تھی۔ ان کو روانہ کر کے خود تیاری پکڑی۔ جلدی جلدی دو چار نوالے لیے اور پرس اٹھا کر پیسے گنتے ہوئے بٹوہ چیک کیا۔ لسٹ بنائی۔ فائل اٹھائی اور اللہ حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ نانی پیچھے بڑبڑاتی رہ گئیں۔ اس کے جاتے ہی اٹھیں، بچوں کے بچائے ہوئے پراٹھوں کے ٹکڑے اور آملیٹ کے چند نوالے کھا کر ہی دل خوش ہوتا تھا۔

اس کی موجودگی میں سخت پرہیز اور غیر موجودگی میں فل آزادی مناتیں اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ اتنے پرہیز اور دوا کے باوجود وہ ٹھیک کیوں نہیں رہتیں۔ اب اسے کیا پتا۔

☆ ☆ ☆

"ہوگئی وقت کی پابندی، آج پھر ایک گھنٹہ لیٹ ہو۔" وہ اسے کلاس کے باہر ہی مل گیا تھا۔

"جتنا وقت کو پکڑنے کی کوشش کرو، ہاتھ سے کھسک جاتا ہے۔ یہ بتاؤ بیوی کیسی ہے تمہاری۔" وہ عجلت میں کلاس کی طرف جاتے ہوئے رکی کہ وہ تیزی سے اس کی طرف آرہا تھا۔

"آج صبح تو اسے ٹھیک ٹھاک چھوڑ آیا ہوں۔ ویسے۔۔"

"فلاسفی کلاس میں جھاڑنا ابھی تو خیر مناؤ، خطرہ سر پر منڈلا رہا ہے۔" اس کا اشارہ پرنسپل کی طرف تھا جو کوریڈور سے گزرتے ہوئے شاید اسی طرف آرہے تھے۔ اس سے پہلے وہ کلاس میں چلی گئی۔

اس نے خفت سے بچوں کے سلام کا جواب دیا اور کتاب کھول کر کھڑی ہوگئی، پہلے ہی گھنٹہ ضائع ہوگیا تھا۔

پرنسپل کلاس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے توجہ نہیں دی۔

"مسٹر سفیر! آپ کلاس سے باہر کیا کر رہے ہیں۔" وہ اب اس سے مخاطب تھے۔

"میں کلاس لے چکا ہوں، میری دوسری کلاس شروع ہونے میں کچھ منٹ باقی ہیں سر۔" اس نے گھڑی دکھاتے ہوئے کہا۔

"سزا کے طور پر بچوں کو باہر کھڑا رکھنے والے ٹیچرز کی دیر سے آنے پر کیا سزا ہونی چاہیے مسٹر سفیر۔ انہیں بھی کلاس سے باہر نہ کھڑا کیا جائے یا پھر اسکول سے ہی۔" وہ در حقیقت اسے ہی سنا رہے تھے۔

"اچھے استادوں کو باہر کرنے کی صورت میں ان

نادان بچوں کے ساتھ ساتھ اسکول کا بھی نقصان ہوسکتا ہے سر۔" سفیر کو ان کی بات بری لگی تھی۔ مگر اس نے نارمل لہجے میں جواب دے دیا تھا۔

"اچھے ٹیچرز..... رول توڑنے والے۔" وہ طنزیہ مسکرائے اور رخ کمرے کی طرف کیا۔

"تو پھر مس ہاجرہ! چھٹی کے بعد میرے آفس میں ملتے ہیں۔" ان کا انداز دھمکانے والا تھا۔

ہاجرہ سر جھٹک کر کام میں لگ گئی۔ ذہن اسی طرف تھا۔ وہ بریک میں آکر کینٹین میں بیٹھ گئی چائے لے کر۔ سردرد سے پھٹ رہا تھا سوچ سوچ کر.....

"پھر سر میں درد ہے؟" سفیر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"بہت درد ہے۔" اس نے پریشانی سے پیشانی مسلی۔

"پرنسپل سے بات ہوئی؟ وہ اب بھی تمہارا ہی پوچھ رہے تھے۔"

"جس دن اسکول چھوڑنے کا ارادہ ہوا' اس دن تفصیل سے بات کرلوں گی۔ فی الحال اتنی ہمت نہیں۔ مجھے پتا ہے وہ مجھے بلیک میل کرے گا۔ اسے بھی پتا ہے کہ یہ نوکری میری مجبوری ہے۔"

"تم اخبار کی نوکری چھوڑ کر یہیں پوری توجہ دو ہاجرہ! بہت زیادہ لوڈ ہے کام کا تم پر' کچھ رحم کرو خود پر۔"

"خود تو اخبار میں دس دفعہ ٹرائی کر آئے ہو۔ مجھے چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہو' کمال ہے۔"

"ارے میری تو بیوی وہاں ہے' مجبوری ہے میری۔ اس پہ چیک رکھنا ہے۔ سمجھا کرو۔" اس نے آنکھ مار کر کہا تو وہ ہنس دی۔

"اسے پتا چلے تو۔"

"گلا نہیں دبا سکتی وہ..... شوہر ہوں اس کا۔"

"فائدہ اٹھا رہے ہو شوہر ہونے کا۔"

"ہر کوئی اٹھاتا ہے۔ تمہارے شوہر سے پھر بھی کم ہی اٹھاتا ہوں۔"

"اس کی تو بات ہی نہ کرو۔" اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"ایک سوال پوچھوں تم سے؟" وہ افسوس سے اسے دیکھنے لگا۔

"ہوگا کوئی فضول سوال ہی۔" وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

"تمہاری نظر میں ہوگا۔" وہ اپنے برگر میں کیچپ اور مایونیز ڈالنے لگا تھا۔

✲ ✲ ✲

"آپ مجھے اس اسکول سے نکال کیوں نہیں دیتیں امی!" وہ اس کے بازو پر سر رکھے آنکھیں موندے ہوئے لیٹا تھا۔

"اسکول میں اب کیا برائی ہے بیٹے! اتنا اچھا اسکول تو ہے۔"

"برائی اسکول میں نہیں ہے۔ ہم میں ہے۔ اس لیے کہ ہم فیس وقت پر نہیں دیتے' جو بہت بری بات ہے۔ آج بھی ٹیچر نے کہا' اگر افورڈ نہیں کرسکتے تو اسکول بدل لو۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو بیٹھا۔

"شانی!..... سوری بیٹے..... ہم کچھ دنوں میں فیس دے دیں گے۔ بس سیلری مل جائے دفتر سے۔ میں مانتی ہوں کہ لیٹ ہوگیا ہے۔ آپ ٹیچر سے کہیں' مجھ سے بات کیا کریں ڈائریکٹ۔"

"امی! ہمیں نکال لیں اس مہنگے اسکول سے۔ ہمارے مسئلے بڑھ رہے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! میں کس لیے دو' دو نوکریاں کرتی ہوں۔ تم لوگوں کے لیے نا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ بس دو دن میں جمع کروادوں گی۔" اس نے کہتے ہوئے اسے ساتھ لگالیا۔

✲ ✲ ✲

لطیف آباد نمبر آٹھ.....

بازار کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا پورا حیدر آباد اسی بازار میں گھوم رہا ہے۔

زینی کو اسکول سے لے کر اس نے ہسپتال کا رخ کیا۔ بمشکل ڈاکٹر نے چند منٹ کی مہربانی کی اور نسخہ لکھ

دیا۔ پھر چار گولیاں ملیں تو دورہ گئیں۔ درزی کی دکان پر رش نے پورا گھنٹہ اسے وہیں کھڑا رکھا۔ خدا' خدا کرکے درزی کو بچوں کے کپڑوں کا ناپ دیا۔ ڈیزائن سمجھایا اور زینی کو گھسیٹتی ہوئی جتنا جلدی باہر نکلنے کی کوشش کرتی' اتنا رش کے اندر پھنس جاتی تھی۔

"ممی وہ فراک..." وہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی تھی۔

یہاں آکر اس کے اندر کتنی خواہشیں بیدار ہوتی تھیں۔ بازار سے ہمیشہ وہ رو دھو کر نکلتی تھی' جرمانے کی صورت آئس کریم لے کر چپ ہو گئی۔ سودا کافی سستا تھا۔

"ممی! بابا... وہ دیکھیں بابا۔" دفعتاً" وہ چلائی۔ وہ پیچھے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ زینی پوری گھوم گئی اسے کھینچ کر اور وہ ششدر... یہ اس کا شوہر ہی تو تھا۔

کیا خوشی تھی قیصر وحید کے چہرے پر۔ اکیس سالہ نوجوان لگ رہا تھا شکل اور حلیے سے۔ آئس کریم کپ ہاتھ میں تھامے اس حسینہ کے ساتھ ساتھ چلتا مسکراتا اور اس کی دلجوئی کرتا جو مصنوعی خفگی سے بار بار سر جھٹک رہی تھی اور وہ اسے منانے کے جتن کر رہا تھا۔ التجائیہ سے انداز میں۔ اس کا دل کیا خاک جلنا تھا جو پہلے جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس نے زینی کا ہاتھ کھینچا اور آگے بڑھنے لگی۔ ابھی ان لوگوں کی نظر ان کی طرف نہیں پڑی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"چلو زینی! وہ کوئی اور ہیں' بابا نہیں۔" وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ واقعی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ جب گھر سے گیا تھا تو بال بڑھے ہوئے تھے۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ حلیہ رف ہی رہتا تھا اس کا گھر میں۔ غنڈہ لگتا تھا' دہشت گرد' جواری سا' وہ منہ پھیر لیتی تھی۔

"وہ بابا ہی ہیں۔" زینی آگے بڑھی' مگر وہ لوگ دکان کے اندر گھس گئے تھے۔

"آپ مجھے بابا کے پاس لے چلیں' مجھے ملنا ہے بابا سے۔"

"بتایا ناکہ بابا نہیں تھے۔ وہ کوئی اور تھے۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔" وہ ڈپٹتی آگے بڑھی اور ہاتھ کے اشارے سے رکشہ والے کو بلایا۔

"وہ بابا ہی تھے۔ آپ نے مجھے ملنے نہیں دیا بابا سے۔ مجھے پتا ہے' وہ آپ کو اچھے نہیں لگتے۔ فون پہ بھی بات نہیں کرنے دیتیں آپ۔ ملنے بھی نہیں دیا۔" وہ پھر شروع ہو چکی تھی۔ اس نے زور کا تھپڑ جڑ دیا اور زبردستی لے کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔

"نانی سے شکایت لگاؤں گی آپ کی؟"

وہ چلائی تو اس نے دوسرے گال پر بھی تھپڑ لگا دیا۔ جانے کیوں غصہ بڑھ گیا اور زینی کی ہوں ہوں گونجنے لگی وہ روتی رہی اس نے کچھ منٹ دیکھا' پھر خود سے بھینچ لیا۔ تھپکنے لگی' پیار کیا۔

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ وہ کوئی اور تھے بیٹا!" ساتھ لگا کر تھپکی دی۔

"وہ بابا تھے۔ بابا ہی تھے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے پہچان لیا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے' اب چپ رہو' گھر جا کر کوئی ذکر نہیں کرنا۔ ورنہ بہت پٹائی لگاؤں گی۔"

اس نے "ہونہہ..." کے انداز میں غصے سے سر جھٹکا۔ اس نے بسورتی ہوئی زینی کو ساتھ لگایا اور بھاگتے مناظر دیکھنے لگی۔ منظر یکایک دھندلائے تھے۔ شاید آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ جو اس نے بے حسی سے رگڑ ڈالیں۔ رونا دھونا بچوں کا کام ہے۔ اس نے خود کو ڈپٹا' مگر زینی اس کی آنکھوں میں دیکھ چکی اور سمجھ چکی تھی۔

"ممی! وہ بابا نہیں تھے۔ کوئی اور تھے۔" اب وہ اسے بہلا رہی تھی۔ پھر دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ جیسے ایک دوسرے کی کمزوری سمجھ گئی ہوں۔ ایک ماں تھی اور ایک ماں کی زینی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آگئی ہاجرہ! ہمیشہ دیر کر دیتی ہے تو۔" وہ پسینہ پسینہ گھر پہنچی تو اماں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ اس نے بڑا سا دوپٹا اتار کر تخت پر رکھا اور سانس لینے کے لیے چوکڑی

مار کر بیٹھ گئی۔

"کیوں جاتی ہے لطیف آباد کے بازار۔" اس کی حالت دیکھ کر وہ پھر بولیں۔

"اماں۔۔۔ میں ایک غریب باپ کی بیٹی' ایک نالائق شوہر کی بیوی' میرے لیے لطیف آباد کا بازار ہی بھلا۔ بڑے بازار بڑے لوگوں کے لیے ہیں۔" اس نے ہنس کر اپنا مذاق اڑایا۔

"تمہیں ہی چڑھا تھا فرماں برداری کا بخار' کتنا منع کیا تھا مت کرو یہ شادی' مگر میری مانتی کہاں ہو۔ رچالی اپنے باپ کے نکمے کنگلے بھتیجے سے بیاہ۔" وہ کلس کر بولیں۔

"اب اُتر گیا ہے بخار اماں۔۔۔ ہاں کمزوری البتہ باقی ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ اور کچن میں چلی آئی روٹی ڈالنے۔ فاطمہ نے آٹا گوندھ رکھا تھا۔ اس نے چولہے پر توا رکھا اور پیڑے بنائے۔

"ممی! زینی نے بابا کو دیکھا ہے۔" فاطمہ دوڑتی ہوئی کمرے سے آئی تھی۔ اس نے زینی کو گھورا۔

"میری ٹیچر کہتی ہیں' دنیا میں ایک شکل کے سات لوگ ہوتے ہیں۔ وہ بابا جیسے تھے۔" وہ ایک دم ہاجرہ کے غصے سے ڈر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ بابا تھے ممی۔ ان کے ساتھ کوئی عورت تھی۔" شانی کافی سنجیدہ تھا۔ سونے سے پہلے اس نے ہاجرہ سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔

"آپ کو کیسے پتا شانی!" اس کے پاس کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔

"زینی کی بابا سے بات ہوئی تھی کچھ دیر پہلے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بال کٹوا لیے ہیں' اور یہ بھی کہ وہ آج کل یہیں ہیں اسی شہر میں۔"

"تو یہ نہیں بتایا کہ ان کے ساتھ کون تھی؟" اب سوال پوچھنے کی باری اس کی تھی۔

"تب تک فون کی لائن کٹ گئی تھی"۔ اس کے سنجیدہ سے لہجے میں بہت کچھ تھا' افسوس' دکھ' شکوہ۔

"کٹ گئی یا کاٹ دی گئی۔" وہ بڑبڑائی اور اسے لیٹنے کے لیے تکیہ دیا۔

"سو جاؤ شانی!" وہ بتی بند کر کے لیٹ گئی۔

"انہوں نے کہا کہ وہ کل یا پرسوں کسی بھی وقت رات گئے گھر آئیں گے ملنے۔ زینی نے الارم لگایا ہے دو بجے کا۔ اب وہ روز الارم لگا کر دو بجے اٹھے گی۔"

وہ اس سے کچھ فاصلے پر لیٹا ہوا بتا رہا تھا۔

"رات گئے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس نے رخ بدلا۔

"ممی! الارم ہٹا دوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تم ملنا نہیں چاہتے۔"

"وہ مجھ سے ملنے کے لیے نہیں آ رہے۔ انہیں صرف زینی کی پروا ہے۔" اسے یہی شکایت تھی۔

"انہیں کسی کی پروا نہیں۔" وہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ مگر سچ یہی تھا۔

"وہ صرف زینی سے محبت کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے اور فاطمہ سے محبت نہیں کرتے۔"

"وہ کسی سے محبت نہیں کرتے۔" وہ کہہ نہیں پائی۔

"میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کیوں محبت نہیں کرتے' کیوں کہ میں آپ جیسا ہوں۔ زینی ان پر گئی ہے۔ ان کی طرح خوب صورت ہے۔ ان کو صرف گورے اور خوب صورت لوگ پسند ہیں۔" شانی کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔

"آپ بھی بہت خوب صورت ہیں بیٹا! ایسے نہیں سوچتے۔" وہ اندھیرے میں اپنے بیٹے کی چمکتی آنکھوں میں تیرتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

"میں اس لیے خوب صورت ہوں کہ میں آپ جیسا ہوں اگر میں آپ جیسا نہیں تو میں خوب صورت بھی نہیں۔۔۔ ممی! مجھے بابا جیسا نہیں بننا۔۔۔ میں آپ جیسا ہی رہنا چاہتا ہوں۔" وہ اس کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

"اس لیے کہ میں اچھا بننا چاہتا ہوں اور سفیر انکل کہتے ہیں' اچھے انسان ہی درحقیقت خوب صورت

ہوتے ہیں اور تمہاری ممی خوب صورت ہیں۔"
"سفیر انکل خود بھی بہت اچھے ہیں اور اچھے لوگوں کو سب لوگ اچھے لگتے ہیں۔" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔
"بابا صرف خوب صورت ہیں مگر اچھے نہیں ہیں۔"
"ایسے نہیں کہتے بیٹے وہ آپ کے بابا ہیں۔"
"جب ہی وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے۔" اس کا لہجہ پھر ویسا ہی ہو گیا۔
"اب وہ آئیں تو اپنی ساری شکایتیں ان سے کرو بنا۔ ویسے تو جنگ بری چیز ہے مگر کبھی کبھار اپنے لیے اپنے حقوق کے لیے جنگ لڑنا پڑ جاتی ہے۔"
وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی اور وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اسکول سے دفتر آئی تو نئی خبر اس کی منتظر تھی۔ سفیر اسے گیٹ پر ہی مل گیا تھا۔
"یہ بتاؤ' یہ خبر کیسی لگی۔" اس نے اخبار اس کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔ وہ اخبار پکڑ کر ہیڈ لائن دیکھنے لگی۔
"مشہور سندھی شاعر قیصر وحید حیات اپنی پرانی محبوبہ شاعرہ کے ساتھ۔۔۔"
اس سے آگے پڑھنے کی ضرورت اسے محسوس نہ ہوئی۔ اس نے اخبار کا گولہ بنا کر اسے تھما دیا۔
"کل تمہاری غیر موجودگی میں خبر لگ گئی تم ہوتیں تو شاید نہ لگتی۔ تمہیں افسوس ہوا ہو گا۔"
"قطعی نہیں۔" وہ قطعیت سے کہتے ہوئے اپنے کیبن میں آگئی۔
"پتا نہیں کیا سوچ کر تم نے اس گھٹیا آدمی سے شادی کرلی۔" وہ ہونٹ کاٹتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا۔
"میں نے اس گھٹیا آدمی سے شادی کرتے وقت کچھ بھی نہیں سوچا' جو بھی سوچا بعد میں سوچا۔"

"ویسے ایک سوال میرے ذہن میں آرہا ہے۔"
"کوئی فضول سوال نہیں چلے گا۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی اور کام دیکھنے لگی۔
"اسے تم سے قطعی محبت نہیں بلکہ تمہاری پروا تک نہیں۔"
"پلیز سفیر! مجھے کام کرنا ہے۔" اس نے کاغذات اٹھا لیے۔
"اپنے کیبن میں جاؤ۔ یہاں کیا کر رہے ہو۔" وہ ڈھیٹ بن کر بیٹھا رہا۔ اس نے کل کا اخبار ساتھ نہ لے جانے کا خود سے وعدہ کرلیا۔ بظاہر وہ سفیر سے بات کر رہی تھی' سارا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس سے پہلے وہ آکر کچھ کہتی اس نے سفیر کی کلاس لینا شروع کردی۔
"تو تم نے کتنے دن کی چھٹی لی ڈیئر؟"
"ہمیشہ کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔"
"یعنی کہ نوکری چھوڑ کر؟" وہ حقیقت میں حیران ہوئی۔ وہ مسکرایا۔
"دیکھو سارا! اپنے شوہر کا بچپنا ملاحظہ کرو ذرا۔ نوکری چھوڑ کر آگیا ہے حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔"
"میں نے اس سے کبھی کسی میچورٹی کی توقع نہیں رکھی۔" سارا چیونگم چباتی ہوئی کیبن کے پاس کھڑی تھی۔
"اب میرے کون سے تین بچے ہیں جن کو پالنے کے لیے میں ہاجرہ کی طرح کولہو کا بیل بنا رہوں۔"
"تم بار بار بچوں کی بات کر کے مجھے کیا جتانا چاہتے ہو۔" سارا غیر ارادی طور پر غصہ ہو گئی۔
"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا یہ کہہ کر میرے دل میں بھی خواہش ہے کہ میرے دو تین بچے ہوں جن کے لیے میں کولہو کے بیل کی طرح کام کروں۔" وہ کندھے جھٹک کر اٹھا۔
"خوب جانتی ہوں تم کیا جتانا چاہتے ہو۔۔۔ اگر بچے نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔" سارا سنجیدہ تھی۔
"میں نے تمہیں کیا کہا ہے۔۔۔ میں تو ہاجرہ سے

بات کر رہا تھا۔" وہ دبے دبے لہجے میں کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"خوب سمجھتی ہوں تمہیں' اس دن کیا کہا تھا کہ دوسری شادی کروں گا۔"

"کہنے میں کیا ہے... کہنے کو تو کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"دیکھا... دیکھا تم نے... یہ مجھے جتاتا ہے۔ طعنے مارتا ہے' تنگ کرتا ہے۔ کہتا ہے' دوسری شادی کروں گا۔ لڑکی پسند کر لی ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیا چل رہا ہے یہ تم دونوں کے درمیان۔" وہ باہر نکل آئی تھی پارکنگ ایریا میں' جہاں وہ دونوں کھڑے تھے منہ سجائے۔

"میں نے مذاق کیا تھا یار! یہ سنجیدہ ہو رہی ہے۔" سفیر بے زار نظر آ رہا تھا۔

"کیوں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ یہ شادی ایک غلطی ہے۔"

"ہاں' کہا تھا۔" وہ ڈھٹائی سے کہنے لگا۔

"تو اب کہہ دو کہ یہ بھی مذاق کیا تھا۔"

"نہیں' یہ مذاق ہرگز نہیں تھا۔"

"اور یہ بھی بتاؤ نا کہ تم نے کہا تھا کہ میری آئیڈیل ہاجرہ جیسی لڑکیاں ہیں' اس نے اگر شادی نہ کی ہوتی تو میں تمہیں چھوڑ کر اسی سے شادی کرتا۔" وہ بھری ہوئی تھی۔

"کہا ہو گا۔" وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا لاپروائی سے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا... اب مجھے لے کر تم دونوں کے درمیان لڑائی ہو گی۔ سفیر! تم نے یہ کہا۔" اسے صدمہ سا ہونے لگا یہ سب سن کر۔

"کہنے میں کیا حرج ہے۔ میں تمہیں آئیڈیلائز کرتا ہوں اس میں کیا برائی ہے۔"

"سفیر..." وہ غصہ سے اسے دیکھنے لگی۔ "بہت دکھ ہوا ہے مجھے یہ سب سن کر۔" وہ تیزی سے گیٹ سے باہر نکل گئی۔ یہ بھول کر کہ دفتر میں کام شروع ہونے والا ہے۔

"رکو ہاجرہ! بات سنو۔" وہ پیچھے لپکا۔

"سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" سارا کو گھور کر آگے بڑھا۔

"ہاجرہ رکو۔ سنو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ پیچھے آیا مگر وہ رکشہ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تیزی سے گاڑی کی طرف آیا۔ "اب بیٹھو۔" سارا کو گھورا اور اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی۔

"تمہیں یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ پہلے ہی اپنے شوہر کی وجہ سے ڈسٹرب ہے' بہت..." وہ رکشے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا' یہاں تک کہ اس نے رستہ روکا۔ رکشے والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور گاڑی سے اترا۔ ساتھ سارا بھی اتری۔

"اترو یہاں۔"

"بھائی صاحب! آپ رکشہ اسٹارٹ کریں۔" اس نے نظر انداز کر دیا دونوں کو۔

سفیر رکشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"یہ کیا بچکانہ حرکت ہے تم لوگوں کی۔" وہ ناچار اتری اور سفیر کے ہٹتے ہی رکشے والا آگے بڑھ گیا۔

"بیٹھو گاڑی میں۔" سارا نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ہاتھ ہٹا کر غصے سے گھورتی ہوئی ناچار بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا ہے' اپنے شوہر کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھ کر تمہیں صدمہ ہوا ہے۔" سارا اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"مجھے صدمہ تم لوگوں کی بکواس سن کر ہوا ہے۔ مجھے سفیر سے ایسی توقع نہ تھی کہ وہ میرے بارے میں ایسے خیال رکھتا ہے۔ دوست سمجھتی ہوں تم لوگوں کو میں۔ سات سال سے ہم لوگ اکٹھے ہیں کبھی ایسی بات نہ ہوئی' آج مجھے لے کر تم دونوں کے درمیان لڑائیاں ہونے لگی ہیں۔ ڈوب کر مر جانا چاہیے مجھے تو۔"

"چلو تینوں مل کر خودکشی کریں گے۔" سفیر ہنسا۔ اور سارا بھی۔ وہ دونوں کو تعجب سے دیکھنے لگی۔

"یار! کوئی بڑی بات نہیں ہوئی ہاجرہ! بلیو می۔ میں ویسے ہی تمہیں آئیڈیلائز کرتا ہوں' ویسے ہی اس

سے کہتا ہوں کہ ہاجرہ کی طرح بنو۔ رہی بات شادی کی تو وہ میں مذاق میں کہہ گیا۔"

"تمہیں پتا ہے' یہ مذاق کسی کو مہنگا پڑ سکتا ہے۔ میری ریپو خراب ہو سکتی ہے' سارا میرے بارے میں یہ سوچ سکتی ہے کہ میں اس کے شوہر کو قابو کرنے لگی ہوں' ہماری دوستی خراب ہو سکتی ہے سوالیہ نشان اٹھ سکتے ہیں مجھ پر۔"

"خیر' اب یہ تو مجھے پتا ہے کہ تم اپنا شوہر تو قابو نہ کر سکیں۔ میرا کیا خاک کرو گی۔" سارا ایسے بات کر رہی تھی جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"طنز کر رہی ہو۔" اس کا لہجہ دکھی تھا۔

"نہیں' بتا رہی ہوں کہ لگام ڈال کر رکھنی چاہیے تھی' ایسے بدمعاش شوہر کو۔"

"جیسے سب کچھ تم لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔" وہ سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔

"گھر چھوڑ دو مجھے' اس سے پہلے کہ بارش ہو جائے۔" اس نے سر باہر نکال کر ایک لمحے کو آسمان کو دیکھا جو بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے بادل گھر گھر کر آرہے تھے اور دھند چھا رہی تھی۔ سفیر نے گاڑی موڑی' اس سڑک پر جو اس کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

"یار ہاجرہ! یہ بستی کچھ زیادہ ہی نیچے نہیں ہے۔ بارش زیادہ ہوئی یا سیلاب کا خطرہ ہوا تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔" سارا تشویش سے دیکھنے لگی۔

"اب ایک نئی ٹینشن نہ دو' مجھے یہ احساس دلا کر۔"

"تم تو ٹینشن لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہو۔" وہ ہنسی

تینوں گاڑی سے اتر گئے گاڑی لاک کی اور بارش سے بچتے بچاتے پھر بھی خاصے بھیگ گئے گھر تک پہنچتے۔

"کون آیا ہے بھئی۔" اماں وہیں سے پوچھنے لگیں آوازیں سن کر۔

"ہم آئے ہیں خصوصاً" آپ سے ملنے کے لیے۔" سفیر اندر آکر ان کے تخت کے پاس جھکا تو انھوں نے سر تھپتھپایا۔

"جیتے رہو بیٹے! کتنے دن بعد شکل دکھائی ہے۔"

"اور میں تو بچوں سے ملنے آئی ہوں۔" سارا کمرے سے دوڑ کر آتے بچوں سے لپٹ گئی۔

"کتنے بڑے جھوٹے ہو تم لوگ۔ ایک اماں سے ملنے آیا ہے' دوسری بچوں کے لیے۔ سب کو بہلانا آتا ہے۔" وہ ہنس کر بیگ رکھ کر کمرے میں گھس گئی۔ اور سفیر بچوں کے ساتھ کچن میں گھس گیا۔

ہاجرہ کپڑے تبدیل کر کے باہر آئی تو سفیر پکوڑے تل رہا تھا۔ بچے اس کے ارد گرد کھڑے تھے' سارا تخت پر چڑھ کر بیٹھی اماں جی سے باتیں کر رہی تھی۔ سفیر بچوں کے ساتھ ایک بڑی سی پلیٹ میں پکوڑے لے کر آیا تھا۔ "لو جی سب کھاؤ موج اڑاؤ۔"

"مجھے کہہ دیتے سفیر! میں تل دیتی۔" وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کی شرٹ پر بیسن کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پکوڑے کھاتا بچوں کے ساتھ صحن میں چلا گیا' بارش میں نہانے۔ سارا بھی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ ان دونوں نے ہاجرہ کو آواز دی' مگر وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔

"مجھے بیمار نہیں ہونا۔" وہ وہیں سے ان لوگوں کو مستیاں کرتے دیکھ کر خوش ہوتی رہی۔ کتنے خوش تھے اس کے بچے' یہ دونوں جب بھی گھر آتے میلہ سا لگ جاتا تھا۔

"اللہ ان کو بھی اولاد سے نوازے۔" اس نے اماں کی بات پر آمین کہا تھا۔

رات گئے تک یہ موج مستی رہی' وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے' اتنی بارش میں سفیر ان سب کو ڈنر کے لیے لے گیا تھا اور پھر تب تک بچوں کے ساتھ بیٹھا رہا جب تک بچے گہری نیند نہ سو گئے۔ وہ بچوں کو کہانی سناتا رہا تھا۔

وہ حسرت سے سوچنے لگی کہ کاش ان بچوں کا باپ بچوں سے ایسے لاڈ کرتا۔ ان کو اتنا وقت دیتا۔ کاش ان کے باپ کو یہ احساس ہوتا۔

سارا اور سفیر کے جانے کے بعد بھی وہ صبح چار بجے

تک جاگتی رہی' بارش رک گئی تھی اور برآمدے کی
چھت ٹپک رہی تھی۔ چھت پر پانی کا دباؤ پڑا تھا'
بوندیں نیچے فرش پر گرتیں تو آواز پیدا ہوتی۔ بوندیں
جیسے دل پر گرتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"اب اس کی طبیعت کچھ بہتر ہے' چوٹ بازو میں
آئی ہے اور ٹانگ میں بھی' مگر چل سکتی ہے۔ ہاں
احتیاط لازمی ہے' جیسے جیسے ٹھنڈ بڑھے گی درد بڑھے گا'
درد کے لیے یہ اسپرے لگانا لازمی ہے' تم سن رہی ہو نا
میری بات۔"
وہ عائشہ سے مخاطب تھا جو خاموشی سے لاؤنج میں
کپڑے استری کررہی تھی۔
"میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے سخت لہجے میں
بات کی تھی' مگر تم دیکھو اگر اسے کچھ ہوجاتا تو.... میں
کیا منہ دکھاتا اس کے ماں باپ کو۔"
"تمہیں پرائی بچی کی ٹینشن کیوں ہے آخر؟"
"اس لیے کہ میری بھی ایک بیٹی ہے' اگر اسے کچھ
ہوجائے تو میرے دل پر کیا گزرے گی' یہ میں ہی جانتا
ہوں۔ تمہاری جب اپنی اولاد ہوگی تو تم سے پوچھوں گا
کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔"
"تم مجھے طعنہ دے رہے ہو۔" اس نے کپڑوں پر
استری رکھ دی' جلنے کی بو آنے لگی۔
"مجھے پتا تھا' تم ایسا ہی کہو گی۔" ابوذر نے ساکٹ
سے پلگ نکالا اور شرٹ کھسکا دی۔ یہ اس کی پسندیدہ
شرٹ تھی۔
"تمہیں میں بری لگنے لگی ہوں نا۔"
"مجھے تمہاری باتیں بری لگنے لگی ہیں۔" اس نے
شرٹ اٹھا کر نیچے پھینک دی۔
"اب یہ بے کار ہوچکی ہے۔"
"تم مجھے بھی ایسے ہی نکال پھینکو گے کہ تم اب بے
کار ہوچکی ہو۔" اس کی بات پر وہ دکھ سے اس کی
طرف دیکھنے لگا اور پھر اپنے کمرے کے ساتھ بنے
چھوٹے سے کمرے کی طرف آیا جہاں زینی سونے کی
کوشش کررہی تھی' وہ آکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔
"درد تو نہیں ہورہا؟" اس نے نفی میں سرہلایا۔
"آپ اس کو لائیں نا۔"
"کس کو لاؤں؟"
"اپنی بیٹی کو لائیں' میں نے اس کے ساتھ دوستی
کرنی ہے۔"
"وہ نہیں آئے گی۔"
"اس لیے کہ آپ اسے لینے نہیں جاتے۔ ملنے
نہیں جاتے ہوں گے۔ اس کا خیال نہیں رکھتے ہوں
گے۔ اس کے لیے کھلونے لے کر نہیں جاتے ہوں
گے۔"
"میں اس کا خیال نہیں رکھتا' نہ کھلونے لے کر
جاتا ہوں نہ ہی ملنے.... پر میں اسے لینے کے لیے کئی
مرتبہ گیا تھا۔ وہ نہیں آئی۔"
"آپ کھلونے لے کر نہیں گئے ہوں گے نا...."
"ہاں... تم پہلے ملی ہوتیں اور مشورہ دیتیں تو میں
اس کے لیے کھلونے لے کر ضرور جاتا۔ تمہیں
کھلونے اچھے لگتے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی لاتے ہوں
گے؟"
"وہ کھلونے نہیں لاتے' مگر وہ میرے لیے چاکلیٹ
لاتے تھے۔ شانی کہتا ہے' وہ بہت برے ہیں' کیوں کہ وہ
شانی اور فاطمہ سے محبت نہیں کرتے' نہ ان سے فون پر
بات کرتے ہیں' نہ پیار کرتے ہیں۔ شانی تو ان کے پاس
بھی نہیں جاتا اور فاطمہ بھی ان کو پسند نہیں کرتی' مگر بابا
مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"
"تمہیں کیسے پتا کہ وہ تم سے پیار کرتے ہیں حالانکہ
وہ کھلونے بھی نہیں لاتے نہ تمہیں اپنے ساتھ لے
جاتے ہیں۔"
"وہ بہت دور رہتے ہیں ہم سے' کہتے ہیں آنا مشکل
ہے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں میں تم سے پیار کرتا ہوں۔
زینی بابا کو بہت پیاری ہے سب سے پیاری۔" اس
نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔
"اتنی زیادہ پیاری۔" وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔
"آپ بھی کہتے ہیں' اپنی بیٹی سے کہ وہ پیاری ہے؟"

"نہیں۔ میں نہیں کہتا۔"

"اب کہیے گا۔"

"اب کہوں گا۔ پر وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی ماں اسے مجھ سے ملنے نہیں دیتی۔"

"امی کہتی ہیں اپنے بابا سے نفرت نہیں کرتے... وہ ہمیں ملنے دیتی ہیں' وہ کہتی ہیں' تمہارے بابا میرے ساتھ زیادتی کرسکتے ہیں' مگر تم لوگوں کے وہ باپ ہیں۔ تم لوگوں سے پیار کرتے ہیں' وہ بہت برے ہیں' مگر وہ ہمارے بابا تو ہیں نا۔"

"تمہاری ممی کتنی اچھی ہیں نا۔"

"ان کا نام ہاجرہ ہے۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اچھا۔ اچھا نام ہے۔ کیا کرتی ہیں وہ؟"

"وہ ڈبل ڈیوٹی کرتی ہیں' سارا آنٹی کہتی ہیں کولہو کی بیل۔" وہ اسے اپنی فیملی کی چھوٹی سے چھوٹی بات جتانے لگی۔

وہ ہفتے کے باقی دن بہت خوش رہا اس کے ساتھ۔ اس نے سوچا تھا اب وہ اپنی بیٹی سے ایک بار پھر ملنے جائے گا۔

ایک آخری بار کوشش کرے گا' اپنی بیوی کو سمجھانے کی' وہ بے خیالی میں زینی کو اپنی بیٹی کے نام سے پکارنے لگا تھا اور عائشہ کے اندر کا شک یقین میں تبدیل ہونے لگا تھا' وہ عجیب وہموں میں گھری تلخ ہونے لگی تھی اور اسی تلخی نے ان کے بیچ ایک دیوار سی کھڑی کردی تھی' اس نے خود ہی خود کو اس سے دور کرلیا تھا اور بہت دن بعد اس نے اپنی بہن سے بات کی' جو اسے ہمیشہ کی طرح ملامت کررہی تھی' ان سب کے تئیں ایک ضد کی بنیاد پر عائشہ کی یہ شادی ایک غلطی ہے۔

☼ ☼ ☼

عائشہ ایک سترہ سالہ ناپختہ ذہن کی مالک معصوم سی لڑکی تھی' اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھی' جو شادی شدہ تھی۔

[illegible] مال لے آنے جانے کے کام سے اسے گھر آنا پڑتا۔ عائشہ نے ابوذر کو پہلی بار وہیں دیکھا تھا۔

وہ لاپروا سا اپنی دھن میں مگن کام کی بات کرکے چلا جاتا تھا۔ عائشہ کو ایک دن پتا چلا کہ ابوذر شادی شدہ ہے' تو اسے گہری مایوسی ہوئی۔ وہ لاشعوری طور پر اسے سوچنے لگی تھی' جس دن اسے پتا ہوتا گھر سے مال جانے والا ہے' وہ بہن کے گھر سے باپ کے گھر آجاتی۔ سارا دن وہاں رہتی۔ وہ بہانے بہانے سے ابوذر سے بات کرتی۔ ابوذر نے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بچپنے کا نام دے کر ہمیشہ نظرانداز کیا تھا۔ اسے پتا نہ تھا یہ معصوم سی ضدی لڑکی خود سے کیا ضد لگائے بیٹھی ہے اور اس کے لیے کیا سوچتی رہتی ہے۔ ان دنوں وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب رہتا تھا' کام سے بھی کبھی کبھار دھیان ہٹ جاتا تھا۔ اس کی زندگی پھر اسے کوئی نیا زخم دینے جارہی تھی وہ خود کو بدنصیب انسان سمجھتا تھا۔ پیدا ہوا تو ماں مر گئی' باپ چھوڑ کر چلا گیا۔ پھپھی نے پالا۔ بس بے دلی سے پالا ہی تھا' پھپھا کی ڈانٹ ڈپٹ مار کا بھی وہی نشانہ بنتا تھا' لڑتے جھگڑتے اور دوسروں کی ڈانٹ کھاتے کھاتے بڑا ہوگیا' پڑھائی میں اس کی دلچسپی کم تھی اور اس کی تعلیم پر کون خرچا کرتا' بچپن سے مزدوری کرتا تھا۔ چھوٹی عمر سے ہی اپنے خرچے خود اٹھالیے' پھپھو کے بچے بھی اس سے بے زار رہتے تھے۔ ایک بار لڑ جھگڑ کر نکال دیا پھر اسے ماموں اپنے پاس لے آئے ماموں کی بیٹی شروع سے اسے اچھی لگتی تھی' آہستہ آہستہ اس کی پسند محبت کا روپ دھارنے لگی اور سونے پہ سہاگہ کہ ماموں نے کسی کے مشورے پر اسے اپنا گھر داماد بنالیا۔ پہلے صرف نکاح ہوا۔ ماموں کی شرط تھی وہ کچھ کرلے تو رخصتی کی جائے' سمیرا ابھی پڑھ رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ سمیرا اسے کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی' وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھی' نہ ہی اس کے دیگر بہن بھائی ایسا کرتے' وہ کسی غیرضروری چیز کی طرح اس گھر کے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور کتابیں پڑھتا رہتا۔ اس نے ماموں کا کام اچھا خاصا سنبھال لیا تھا۔ ماموں

نے اپنی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بیاہ دیا تھا۔ اب سمیرا ہی رہتی تھی' بڑے اچھے طریقے سے اس کی بھی شادی ہو گئی' نہ کوئی خرچا' نہ جھنجٹ' نہ مسئلہ' نہ مسائل اسے اپنی من پسند ساتھی مل گئی۔ اس نے سمجھا کہ زندگی آسان ہو گئی ہے' وہ اب خوش رہے گا سارے دکھ' مسئلے' پریشانیاں ختم ہو جائیں گی' مگر بہت جلد اسے اپنے خیالات بدلنے پڑے۔

☼ ☼ ☼

وہ کم عمری میں ہی قیصر کی محبت میں مبتلا تو نہ ہوئی مگر متاثر ضرور تھی۔ قیصر اس سے چار سال بڑا تھا' وہ اسے بات بے بات سمجھاتا۔ رعب جھاڑتا اپنے بڑے پن کا رعب اسی پر جماتا۔ وہ اس کی صلاحیتوں کو مان گئی تھی' اسے پتا تھا وہ اسے دلیل سے یا جواز سے قائل نہیں کر پاتی۔ جب وہ بولتا تھا تو حیران کر دیتا' مسحور کر دیتا گرفت میں لے لیتا' سحر زدہ ہو کر سحر زدہ کر جاتا' کتابیں بہت پڑھتا تھا۔ اس کا کمرہ کتابوں سے بھرا رہتا اور طرح طرح کے ------ لکھے پھاڑے ضائع کیے ہوئے گولہ بنے ہوئے کاغذوں سے۔ خود اس نے ساری زندگی باپ کو بھی کتابوں میں غرق دیکھا تھا۔ یہ شوق اس کی تو چڑ بن گیا مگر اس کے اکلوتے بھتیجے قیصر وحید کے اندر سرایت کر گیا' اتر گیا' ٹھہر گیا اور قیصر جیسے سنور گیا' بلکہ سنور ہی جاتا اگر کتابوں تک ہی محدود رہتا۔ وہ تو طرح طرح کی محفلوں مشاعروں میں اٹھنے بیٹھنے' جانے لگا۔ اس کا رنگ ڈھنگ بدلتا گیا بڑے بڑے الفاظ بولتا اور لمبی آہیں بھرتا تو جوانی کی مستی تھی اور عشق کا بخار تھا محبت بھی سونے پر سہاگہ تھی۔

ان کے گھر پر عجیب غریب ملنے والے' شاعر ادیب آنے جانے لگے۔ جن میں کچھ تو واقعی فنکار تھے' اس نے ایک ادیب کی گہری آنکھوں میں عجیب حیرتوں کا سمندر دیکھا تھا۔ پتا چلا اس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں نوکری نہیں ملتی' نہ کوئی کام دھندا بس لکھتا رہتا ہے' ادبی پرچوں نے اعزازیہ کیا دینا تھا' پرچہ تک بھیجنا محال تھا جس کے دروازے پر چار رسالے مفت میں

آجاتے' وہ خود کو اس دنیا کا خوش قسمت اور سب سے بڑے پائے کا لکھاری سمجھتا' کوئی ایسا ہوتا کہ جیب میں پچیس ہزار لیے لیے کتاب چھپوانے کو بے تاب پھرتا۔ پبلسٹی کے لیے بے چین' ہس رائٹر' شاعر کہلوانے کے شوق نے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔

وہ کونے میں دبکی بیٹھی ان سب کی عجیب و غریب لن ترانیاں بابا کے قہقہے اور قیصر کی معنی خیز مسکراہٹ دیکھتی سنتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی اور ناکام ہی رہتی۔

بس احساسات اُترتے رہتے دل میں۔

اسے ادیب دنیا کی سب سے بیچاری قوم لگتی' اسے ٹوٹ ٹوٹ کر ترس آتا ان نکموں پر جنہوں نے گھر والوں کا جینا محال کر رکھا تھا' نہ کما کر کھلاتے نہ خود کا ہی بوجھ اٹھا پاتے' محفل یاراں میں شام تمام کر کے سڑکوں کے حوالے رات کر آتے' اباجی بگڑتے بھی تھے ان عادتوں پر' اس نے کبھی اپنے باپ کو بے وجہ مارا پھرتے نہیں دیکھا حالانکہ حلقہ احباب ان کا بھی اچھا خاصا تھا' مگر چن چن کر معصوم اور مسکین لوگ جمع کیے تھے جو کہ اچھے خاصے شرفا بھی معلوم ہوتے تھے۔

قیصر جن لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا تھا ان میں سے کچھ آزادی اور کمیونزم کے نام پر اڑتے پھرتے' نہ کوئی دین مذہب نہ عبادت نہ کوئی کام دھندہ بس اڑتے بھاگتے ٹہلتے پھرو۔ سب کچھ خود بخود ہی ہو جائے گا اور ہوتا ہے' خود اپنی ذات سے بیگانہ تھے' اس نے دیکھا وہ دیر سے گھر آنے لگا۔

بابا دیر تک انتظار کرتے۔ فکر مند ہو کر سوتے' عزیز بھائی کی اکلوتی اولاد' بھائی بھابھی جن کو ٹرک نے کچل دیا اور قیصر کو ہاجرہ کے ابا نے گلے سے کیا سینے سے لگالیا۔ آنکھوں کا سرمہ بنادیا۔ آنکھ کا نور تھا' جینے کی آس تھا۔ اکلوتی بیٹی کی کئی خواہشوں کو پس پشت کیا' بیوی چھوڑ کر چلی گئی۔ جھگڑے بہت ہوتے تھے دونوں کے' پھر خلع کا نوٹس آیا' تو طلاق ہو گئی جس پر اثر پڑا' وہ ہاجرہ تھی۔ لوگ ماں پر نفرین بھیج رہے تھے کہ جوان ہوتی بچی کی ماں گھر چھوڑ کر گئی اس عمر میں ہاجرہ بس چار

چھ دن روئی' ابا کی محبت نے سنبھال لیا' وہ باپ کو خود بھی ٹوٹ کر چاہتی تھی' بس بیچ میں قیصر جیسا لاپروا دیوار نہ بنتا تو ساری محرومیاں مٹ بھی جاتیں وہ قیصر کے کمرے کی صفائی کرتی اور بعد میں کئی بار ڈانٹ بھی کھاتی۔

"میرے رسالے کہاں رکھ دیے۔" بکھرے کاغذ سمیٹ کر ایک جگہ رکھنے کی صورت میں بھی شامت آتی۔

"اب اس نظم کا دوسرا سرا کہاں ملے گا۔ اتنے سارے کاغذات۔ کہا بھی تھا کہ مت چھیڑا کرو ان کو۔"

وہ کاغذ تلاش کرتے ہوئے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیتا اور کمرہ پھر کباڑ خانہ بنا جاتا۔ کہیں واسکٹ کہیں جوتا' صوفے کی گدیاں ادھر ادھر پڑی ہوئی۔ کرسی کے نیچے سے تولیہ بر آمد ہو رہا ہے تو شرٹ کونے میں دبکی ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر چیزیں اکٹھی کرتی۔ سلیقے سے رکھتی۔

ان ہی دنوں اس نے شیو بڑھالی۔ سیاہ لباس زیب تن کرنے لگا۔ رات گئے تک کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ پتا چلا کسی نوجوان شاعرہ کے عشق نے آلیا اور زیر کر دیا ہے۔

پھر جلد ہی شاعرہ کی شادی کا کارڈ آن پہنچا۔

وہ ڈھے سا گیا' مٹ سا گیا' کھانا پینا چھوڑ دیا' چائے کی پیالی پر پیالی پیے جاتا' بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا' ابا جی کو اس کی حالت نے مزید کمزور کر دیا تھا۔

کسی نے مشورہ دیا' شادی کروا دو۔ وہ کئی روز تک اس کی منتیں کرتے رہے۔ وہ نہ مانا' جس دن دل کا پہلا اٹیک ہوا بال بال بچے۔

اس دن انکار کی ہمت قیصر کو نہ تھی۔ ہاجرہ اور قیصر کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ ایک بے جوڑ رشتہ طے پایا۔ باپ کے دل کا بوجھ اتر گیا۔ بیٹی کو بہت سمجھایا بہلایا۔ وہ شروع سے قیصر کی خدمتیں کرتی تھی اب کچھ مزید ذمہ داری آگئی کوئی فرق نہ پڑا۔ قیصر کا رویہ پہلی رات' بہت برا' پھر صرف برا آہستہ آہستہ بس نارمل ہو تا گیا' کبھی بات کرتا کبھی بات کا جواب تک نہ دیتا۔ کبھی ہوں ہاں کر تا رہتا تو کبھی بے طرح جھڑکتا۔

اس کے ابا اپنے نواسے کی آس لیے دنیا سے چلے گئے۔ وجہ وقت پر علاج نہ ہونا' بے احتیاطی بھی تھی' وہ روتی ٹوٹ کر روتی' بکھر گئی ڈھے گئی' مگر قیصر جیسے انسان کو زیادہ فرق نہ پڑا' اس کے آنسو اس کی محبوبہ کے عشق میں بہنے کے لیے تھے۔ اور فکر معاش فکر حال نہ تھی' فکر فراق تھی اور جوانی پر بیت بازی پسندیدہ مشغلہ تھا۔

وقت بے رحمی سے گزرتا گیا۔ پڑھتے پڑھتے ایک دن حالت تشویش ناک ہوئی پڑوسن اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی پتا چلا کہ خیر سے امید سے ہے۔ عجیب کیفیت تھی' قیصر کو تب بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ فاطمہ کی پیدائش پر اسپتال سے وہ اکیلی آئی قیصر نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال دی اور بس۔ چھو کر پیشانی پیار تک نہ کیا' دیکھا تک نہیں کہ کس پر گئی ہے' یہی طریقہ رہا آگے بھی۔ فاطمہ کو پالنے کے ساتھ ساتھ ابا کی دکان سے آتے پیسوں سے وہ ضرورتیں بھی پوری کرتی رہی۔ فاطمہ کے بعد شانی کی آمد نے بھی زندگی میں کوئی ہل چل نہ مچائی۔

بس اتنا فرق تھا کہ کبھی جھک کر پیار کر لیتا' یا دیکھ لیتا' مگر زیادہ نہیں' وہ شکل وصورت میں ماں پر گیا تھا۔ نقش اچھے تھے' سانولی رنگت تھی۔ فاطمہ بھی بس خوش شکل تھی پھر زینی ہوئی' ایک کمرے میں تین چھوٹے چھوٹے بچے۔

وہ ان کے رونے پر چلاتا چیختا برا بھلا کہتا۔

ان ہی دنوں یونیورسٹی میں ہاجرہ کو سفیر اور سارا مل گئے' دونوں شرارتی نٹ کھٹ زندگی سے بھرپور ہنستے مسکراتے اچھے خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی فکر نہ تھی بس پڑھنا تھا اور شادی کرنی تھی۔ اسے گھر لوٹنے کی فکر ہوتی تھی' مسائل تھے گھر آکر اس نے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کے اخراجات کا دباؤ تھا۔ سارا اس سے لڑتی کہ قیصر کو کہو' اسے احساس دلاؤ' اس سے پیسے لو' اس کی ذمہ داری ہے' سفیر اسے برا بھلا کہتا' وہ پہلے پہل لڑتی'

جھڑکی روتی ہوتی مگر آہستہ آہستہ اس نے سب چھوڑ دیا۔ اس کا شوہر اسی لائق تھا۔

ہاجرہ پہلے پہل قیصر سے لڑتی، احتجاج کرتی، پھر جب دیکھا کہ آگے اثر نہیں ہوتا، پہلے جو وہ چپ چاپ سن لیتا یا کبھی کبھار جھڑکنے لگتا تھا، اب مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔

وہ اپنی عزت بچا کر امان مانگتی تھی۔

بچوں کا باپ کئی دنوں میں آتا، کبھی بچوں سے بات چیت کر لیتا۔ زینی خود ہی چمٹتی تھی، ٹانگوں کو پکڑ لیتی، ہاتھ تھام لیتی، ارد گرد گھومتی، چڑیوں کی سی بولیاں بولتی تھی۔ ارد گرد منڈلاتی رہتی، تھی بھی بہت پیاری، خوب گوری چٹی، سفید رنگت اور نقش میں باپ پر گئی تھی، اسے بس اس سے ہی انسیت تھی، وہ اٹھا لیتا یا چوم لیتا، جس دن جانا ہوتا وہ زینی سے چھپ کر جاتا۔ دیکھا سوئی ہوئی ہے تو ہی جاتا ورنہ وہ بری صورت میں اسے پتا تھا اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لینا ہے۔

البتہ یہ پروانہ تھی کہ اس کے جانے کے بعد وہ کیسے روتی چلاتی ہے، چیزیں پھینکتی ہے، بابا کی مالا جپتی ہے۔ ننھے ننھے گالوں پر موٹے موٹے آنسو بہتے ہیں اور ہاجرہ دل تھام کر بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی کبھار خود بھی رونے لگتی ہے تو کبھی اسے ایک تھپڑ مار کر پھر کلیجے سے لگا لیتی ہے، تڑپتی اس لیے ہے کہ وہ ماں ہے۔

مگر یہ باپ کیسا باپ ہے، اس شخص کا شوہروں کے بہت برے قبیلے سے تو تعلق تھا ہی مگر وہ باپ بھی بہت برا ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ دکھ کا باعث بنتا ہے۔ وہ باپ کہلانے کے قابل نہیں ہے، کوئی اسے جا کر بتائے تو۔

☆ ☆ ☆

سمیرا پہلے پہل صرف بیزاری کا شکار تھی، پھر باقاعدہ چڑنے لگی۔ اس کی چیزیں کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیتی۔

شادی کو ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا، اور یہ ایک سال کی طرح گزرا تھا۔

[illegible] وہ اس کی ہر [illegible] کرے گا۔ وہ آیا تو کمرے کے باہر کئی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ شیو کا سامان، پرانے جوتے جن کے تلوے اکھڑنے کو تھے۔ پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیب جس کو اندر اڑس اڑس کر وہ چھپا لیا کرتا تھا، بوسیدہ کوٹ، سستے کپڑے کی چند قمیصیں، لنڈے کی خریدی ہوئی جینز اور ٹی شرٹ۔

ٹوٹی ہوئی زپ والا بیگ، سب کچھ باہر تھا، اس نے سب چیزیں سمیٹیں، یکجا کیں، جمع کیں۔ تھیلے میں ڈالیں اور تھیلی لے کر اندر آگیا۔

"تم اس کاٹھ کباڑ کو پھر سے اٹھا لائے ہو۔" وہ اسے آتا دیکھ کر چیخی۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب چیزیں پھیلا کر نہیں جاؤں گا۔ استعمال کے بعد اسی بیگ میں رکھ کر جاؤں گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں، انہیں نکالو یہاں سے، مجھے اپنے کمرے میں اتنا زیادہ کباڑ بھرنے کی کوئی خواہش نہیں۔"

وہ کہنا چاہتا تھا، یہ میری چیزیں ہیں، کیا میں تمہارے لیے بے کار ہوں تو پھر مجھے بھی کمرے سے نکال پھینکو اور اسے پتا تھا وہ کہہ دے گی کہ تم بھی نکل جاؤ، اتنے عرصے میں وہ اس کے دل میں پلنے والی نفرت کو تو جان ہی گیا تھا۔

اسے اس لڑکی پر رحم بھی آیا، لڑکی جتنی پڑھی لکھی ہو۔ ماں باپ جس قدر آزاد خیال ہوں، مگر لڑکی کو پسند کی شادی کا اختیار ہرگز نہیں دیتے۔ اس کا غصہ، چڑچڑاپن، نفرت گریز، جھجک بے معنی نہ تھی اور اسے حق تھا اس کی بہنوں کی اچھی جگہ شادیاں ہوئی تھیں، ان کے شوہروں کا شمار اچھے کاروباری لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ اچھی شکلوں والے اچھے پیسے والے، اچھی گاڑیوں میں بن ٹھن کر آتے تو کسی ریاست کے شہزادے لگتے تھے۔ اور ایک اچھی شکل والا صرف پیسہ گاڑی، بنگلہ نہ ہونے کی صورت میں کونے میں دبکا بیٹھا سگریٹ پیتا رہتا تھا۔

اس نے سوچا وہ بھی کمائے گا پیسہ بنائے گا تو سمیرا اس کے ساتھ سیٹ ہو ہی جائے گی۔

سمیرا کا رویہ کبھی نارمل ہو جاتا' کبھی اسے چڑچڑے پن کے دورے پڑتے اور وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتی جاتی۔

وہ چپ چاپ تماشائی بنا کو سنے سنتا اس کے یا پھر کمرے سے نکل جاتا۔ اس رات باہر سو جاتا' گھر نہ آتا پھر غصہ دبتا تو آجاتا' سمیرا کے ماں باپ بھی یہ سب محسوس کر رہے تھے اس کی ماں کا رویہ بھی ابوذر سے اتنا ہی تلخ تھا۔

احسان صاحب کے چہرے پر ہر وقت تفکر چھایا رہتا۔ بیٹی کے ساتھ زبردستی کرنے کا احساس اندر ہی اندر بے چین کیے رکھتا' بس کسی کو اس نوجوان مسکین صورت والے ابوذر پر رحم نہ آتا تھا' فکر نہ ہوتی تھی' اس کا اپنا کون تھا جو پریشان ہوتا' اس دنیا میں باقی سارے رشتے ایک طرف ماں اور باپ ایک طرف' اس کے ماں باپ نہیں تھے' وہ کس کے آسرے پر احتجاج کرتا' اختلاف کرتا' اعتراض کرتا' سارا کچھ ایک طرف' اس کی بے بسی ایک طرف۔

☆ ☆ ☆

ہاجرہ کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ ایک بیٹا ہوا جو ہاجرہ سے تو کئی سال چھوٹا تھا' ہاجرہ کی ماں جب اس سے فون پر بات کرتے ہوئے حمید کے قصے شرارتیں باتیں بتاتی تو اس کا دل چاہتا دوڑ کر وہاں پہنچ جائے' اس کا کوئی بھائی نہ تھا۔ حمید کو بھائی تصور کر کے اس کا دل نرم ہو جایا کرتا تھا' تب ہی اس کی ماں اس کے پاس لوٹ کر آئی جب وہ خود ایک ماں تھی' اس کے تین بچے تھے جن کے لیے وہ دن رات محنت کرتی تھی' ایک کے بعد ایک کام' پھر اسکول میں جاب مل گئی۔ سیلری بس زیادہ اچھی نہ تھی اتنی کہ گھر کا راشن آجاتا اور دو وقت کی روٹی میسر ہو جاتی۔

ماں کے آنے کے بعد خرچہ دوہرا ہو گیا۔ اس کا علاج اس کی دوائیں' اس نے ایک دو بار حمید کے گھر فون کیا جس کی بیوی نے اسے دس باتیں اور خوب سنائیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ وہ ماں کے بہانے خود پیسے ہڑپ کر جائے گی' یا پھر اس بڈھی کو کہو' اپنا انتظام خود کر لے بھوکے کہے گئے لفظ ماں نے بھی سنے۔

حمید بھی ساتھ تھا پر کچھ نہ کہا نہ بیوی کو ٹوکا' بلکہ کہہ دیا "اماں کو بول دیں روز روز پیسے کہاں سے لاؤں گا' میرا اپنا گھر ہے سو خرچے ہیں۔ اب بچہ بھی ہے کہاں سے پیسے بچاؤں' میں جوان کو بھیجوں بیٹی پر ناز تھا تو بیٹھی رہیں بیٹی کے گھر۔ بیٹی کیا دوائیں بھی نہیں دلا سکتی ماں کو۔" یہ اس ماں کا بیٹا تھا۔

ہاجرہ فون پکڑ کر ساکت رہ گئی' ماں کو پہلی بار احساس ہوا کہ بیٹے مانگتے ہوئے بیٹیوں کو نظر انداز کرتے وقت بیٹی کے دل کی نرمی' محبت سچائی اور وفاداری کا ادراک پہلے کیوں نہ تھا۔

بیٹے کے لیے روتی ماں کو ہاجرہ نے گلے سے لگایا اور بچوں کی طرح پیار کیا۔ تسلی دی' سمجھا دیا' اس کے بعد ہاجرہ نے ماں کی ذمہ داری ایسے اٹھالی' جیسے تین بچوں کی ذمہ داری اس کے سر پر تھی' سارا کی اخبار میں جاب ہو گئی۔ اس نے وہیں اس کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور ایک دن اسے دفتر بلوا لیا' پہلا مہینہ ٹیسٹ پر رکھا گیا۔ وہ ذہین تھی' محنتی تھی۔ خوب اچھا کام کیا۔ وہ اسکول اور اخبار کے دفتر سے ملی تنخواہ سے گھر چلا رہی تھی۔ بچوں کی تعلیم پر خرچا ہو رہا تھا۔ ماں کا علاج ہو رہا تھا۔ کبھی ایک دو ہزار بچ جاتے اور کبھی سارے بچے ہوئے بھی خرچ ہو جاتے۔

مشکل وقت کو اچھے وقت کی امید پر ٹالتی رہی۔ بچوں کو بہلاتی پھسلاتی رہی۔ ساری باتیں ایک طرف۔ اس لاپروا آوارہ شخص کے دیے گئے زخم ایک طرف' جو اس کے بچوں کے دلوں پر اثر ڈالتے تھے۔

کئی دنوں سے زینی الارم لگا کر سو رہی تھی۔ اسے پتا تھا وہ رات گئے اٹھتی ہے۔ پھر سو جاتی ہے۔ وہ فون ملاتی ہے وہاں سے ریسیو نہیں ہوتا یا نمبر بند ملتا ہے۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے لمبے ہوتے جاتے

ہیں۔ پھیل جاتے ہیں۔

وہ اپنی زینی کو کلیجے سے لگا کر ڈھیر سارا پیار کرتی اور دعا کرتی کاش اس کے پیار اس کی محبت سے وہ کمی پوری ہو جائے جس کی بچوں کو باپ سے توقع ہے۔

☼ ☼ ☼

مگر ایک دن معاملہ صاف ہو ہی گیا۔ قیصر آیا تھا' بہت خوش گوار تاثر چہرے پر سجا تھا۔ نیا نیا دولہا۔ بچوں کو پکڑ کر بیٹھ گیا ''میں تمہیں تمہاری نئی ممی کی تصویر دکھاؤں۔''

سیل فون کھول کر بیٹھ گیا۔

ہاجرہ کے ہاتھ سے برتن گرتے گرتے بچا' شانی کا چہرہ بجھ گیا۔ فاطمہ پاس سے اٹھ گئی۔

زینی حواس باختہ تصویریں دیکھتی رہی۔ منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ باپ کے پاس سے اٹھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ زینی کو ساتھ لگائے بیٹھا بتا رہا تھا۔

''یہ وہی آنٹی ہیں جو آپ کے ساتھ آئس کریم کھا رہی تھیں؟''

زینی کی انگلی اس تصویر پر رک گئی' معصوم آنکھوں میں اور بھی سوال تھے' فاطمہ کونے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ شانی کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہاجرہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' کمرے میں گئی' اس کی ساری چیزیں اکٹھی کیں ایک بیگ میں بھریں اور باہر آکر منہ پر دے ماریں۔

''آج کے بعد میرے بچوں کی زندگی میں زہر گھولنے مت آنا۔ نکل جاؤ اور رہو اپنی نئی بیوی کے ساتھ۔ میرے بچوں پر تمہارا اور تمہاری گندی فطرت کا سایہ بھی نہ پڑے۔'' وہ پہلی بار چیخی تھی۔ آنکھوں میں پانی بھرا تھا اس کا چہرہ دھندلا تھا وہ خباثت سے ہنسا تھا۔

''اس گھر میں میرا بھی حصہ ہے۔ لے کر رہوں گا۔ تم مجھے ایسے نہیں نکال سکتیں' میرے بچوں کو مجھ سے۔''

''بکواس بند کرو۔ تمہارے بچے۔ کوئی تعلق نہیں ہے تمہارا۔''

اس کا تھیلا باہر پھینکا' زینی کو اس سے الگ کیا۔

''نکلو یہاں سے ابھی اور اسی وقت۔ تمہاری اس گھر میں اب کوئی جگہ نہیں۔'' دھکا دے کر باہر کیا۔

''جا رہا ہوں' جا رہا ہوں' مجھے کوئی شوق نہیں ہے آنے کا۔ دس دس دفعہ فون کرتے ہیں۔ تب ان سے ملنے آتا ہوں۔ تمہاری شکل دیکھنے کا شوق نہیں ہے مجھے۔''

بکتا جھکتا دروازے سے بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

بچے رونے لگے' بچوں کی ماں نے تینوں بچوں کو ساتھ لگا لیا۔ وہ خود بھی رو رہی تھی۔

بچوں کی نانی نے آج اپنی ــ بیٹی میں ایک ماں دیکھی۔

ایسی ماں جو کبھی ہاجرہ کی ماں میں نہ جاگ سکی۔

☼ ☼ ☼

پرنسپل نے کمرے میں بلا کر خوب برا بھلا کہا تھا اور نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ ایک اور امتحان آگیا' وہ چپ چاپ چلی آئی۔ وہ نوکری ڈھونڈنے لگی' صبح سویرے نکل جاتی پھر شام کو اخبار چلی جاتی وہاں بھی اس کی سیلری نہیں بڑھائی جا رہی تھی۔ بمشکل اس بار سترہ ہزار ہوئے' بل جمع کروانے کے بعد کئی چیزیں راشن سے نکالنے کے بعد بھی راشن ـ پورا نہ ہو سکا' اماں کی آدھی دوائیں لیں' آدھی رہ گئیں۔ ابھی بچوں کے اسکول کی فیس باقی تھی۔

''کیا ہوا ہاجرہ! کچھ بنا؟'' اماں پریشان تھیں۔

''کچھ نہیں ہوا اماں۔'' چہرے سے تھکن ظاہر تھی' اور لہجے سے بیزاری۔ وہ کمرے میں چلی گئی۔

شانی ایک کپ چائے بنا لایا۔

''کیا ضرورت تھی پتی چینی ضائع کرنے کی۔'' لہجہ عجیب سا تھا۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ اور پھر دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا' شام کو پھر بارش ہوئی چھت ٹپکنے لگی' ایک کمرے کی دیوار بھی گیلی سی ہو گئی' اس نے سب کو ایک ہی کمرے میں

منتقل کردیا' بچے رات تک سو گئے۔ بجلی چلی گئی تھی' وہ لیٹی ہوئی تھی' پتا تھا اماں بھی اس کی طرح پرانے ٹیرز گارڈز والی بوسیدہ چھت کو آسمان سمجھ کر گھور رہی ہیں۔

"اماں۔" آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔

اماں سیدھی ہو گئیں۔ "بول"۔

"اماں۔ آپ حمید کے پاس چلی جائیں۔"

وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگیں' جو ابھی تک چھت کو دیکھ رہی تھی۔ "تو چاہتی ہے میں وہاں مروں جہاں کوئی میرے پاس دو منٹ بیٹھ کر بات تک نہیں کرتا۔ جانوروں کی طرح کوٹھی میں ڈال کر روٹی دے جاتے ہیں۔ ایسے پھینک کر جیسے جانوروں کے آگے چارہ ڈالا جاتا ہے۔"

"اماں۔" اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہاں آپ کو کیا ملتا ہے اماں! بمشکل دوائیاں۔ پھل تک نہیں لا سکتی میں آپ کے لیے۔ اور اب دوائی بھی۔ آج آپ کی گولیاں نہیں لائی میں۔ جو بہت ضروری تھیں۔ جن کے بغیر آپ کو نیند بھی نہیں آتی۔"

"ہاجرہ۔ میں تیرے پاس مرنا چاہتی ہوں۔" آواز کس قدر نحیف تھی۔

"اماں! اس طرح کی باتیں کر کے آپ مجھے پریشان کر رہی ہیں۔" شکوہ در آیا۔

"ہاجرہ۔ میں چاہتی ہوں' مجھے یہاں موت آئے۔

"ہاجرہ! میں سب سے پہلے یہاں بیاہ کر آئی تھی۔ یہیں تو پیدا ہوئی۔ بڑی ہوئی۔ تیری شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ اس گھر نے پھر سے مجھے پناہ دی۔ یہ گھر بہت بڑی جگہ رکھتا ہے۔ کہنے کو چھوٹا ہے۔ مجھے دوبارہ نہ کہنا کہ حمید کے پاس چلی جا۔ میں یہاں خوش ہوں ہاجرہ! ہر حال میں خوش ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں سونے کی۔ نیند آجائے گی۔ گولی کی فکر نہ کر۔"

"کس چیز کی فکر کروں اور کس چیز کی نہ کروں۔"

آج اسے بھی گولی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ نیند کی گولی کی۔

☆ ☆ ☆

سمیرا کو ڈاکٹر نے خوش خبری دی تھی۔ وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ ماموں بھی بہت خوش تھے لگا جیسے سب کچھ ٹھیک ہونے جا رہا ہے' وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ بہت کوشش کی ختم کروانے کی مگر کوئی بھی اس کے اس کام میں شامل نہ ہوئی۔ جیسے تیسے تکلیف میں یہ مہینے تمام ہوئے۔ ننھی پری کی پیدائش پر کون خوش نہیں تھا۔ ایک اس کی ماں تھی جو نڈھال سی بیٹھی تھی' پھیکی مسکراہٹ تک ہونٹوں پر نہ تھی۔ مگر کیا کرے۔ آخر ماں تھی بچی کے رونے پر تڑپ جاتی تھی۔ ابوذر سے اس کا رویہ آخری حد تک خراب ہو گیا۔ فیصلہ کرلیا تھا کہ اب اسے یہاں ٹکنے نہیں دینا۔ ایک دن اس نے ابوذر کو دھمکی دی کہ "وہ خودکشی کرلے گی۔ اگر اس نے نہ چھوڑا تو" اس نے بہت سمجھایا کہ اب ہم دونوں ایک بچی کے ماں باپ بن گئے ہیں۔ کم از کم اس کے لیے کچھ سوچو۔ مگر وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی۔

دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ وہ تھک ہار کر اسے طلاق کا نوٹس دے کر نکل آیا۔ چند ماہ کی بچی کی طرف دل کھنچتا تھا مگر کیسے دیکھتا۔ کیسے رہتا وہاں۔ اب کوئی جواز نہ تھا۔

تب ہی اسے عائشہ کے والد ملے' جنہوں نے اسے اپنے کام میں شامل کرلیا اور آہستہ آہستہ اتنا اعتماد آگیا کہ اسے گھر کے کاموں میں بھی شامل کرلیا تھا۔

وہ ایک دو بار بچی سے ملنے گیا مگر نامراد لوٹا۔

اسے عائشہ کی محرومیوں میں اپنی محرومیاں نظر آتی تھیں۔ عائشہ کی منگنی ہو رہی تھی اور ہو بھی گئی۔ لڑکا اچھا تھا۔ اس کا ہم عمر۔ اس جیسا نٹ کھٹ' خوب صورت' پڑھا لکھا۔ مگر عائشہ خوش نہ تھی۔ وہ کئی دنوں سے کھانا نہیں کھا رہی تھی ڈھنگ سے۔ اسے عائشہ میں سمیرا نظر آنے لگی تھی۔

وہ اس کے ماں باپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ زبردستی نہ کریں۔ مگر اس سے پہلے عائشہ نے حد کردی۔
شور مچادیا کہ شادی کرنی ہے تو ابوذر کے ساتھ۔
گھر میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ابوذر کام چھوڑ کر چلا گیا۔ دوسری جگہ کام ڈھونڈنے لگا۔
خوش قسمتی سے اختر مل گیا۔ اسکول میں ساتھ پڑھا ہوا تھا۔ اس نے سفارش کی۔ بات کی۔ کمپنی میں جگہ بھی خالی تھی۔ کمپنی کو ایک محنت کش نوجوان ملا اور نوجوان کو اپنا روزگار۔
کئی سالوں بعد وہ چین کی نیند سویا تھا۔ اسے اب پتا چلا کہ چین کی نیند کیا ہوتی ہے۔

✵ ✵ ✵

ایک سال بعد عائشہ کے باپ نے ابوذر کو ڈھونڈا تھا۔ اور عائشہ سے نکاح پڑھوا دیا۔ ابوذر نے خاصی حیرانی سے اپنے نکاح میں شرکت کی۔ نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے لڑکیوں کی طرح ہاتھ بھی کانپے تھے۔
اب اسے عائشہ کے باپ نے ایک ٹاسک دیا کہ وہ کہیں بھی، کسی بھی جگہ اپنا گھر بنالے اور اسے رخصت کرا کے لے جائے، کیمپ سے نکل کر گھر بنانے کا مرحلہ سخت تھا۔
وہ پہاڑ کی چھوٹی سی چوٹی جہاں پر ان کا کیمپ کئی مہینوں تک لگا رہا تھا۔ اسے وہ چوٹی اور اس کے نیچے بہتی ہوئی نہر کتنی اچھی لگتی تھی۔ چوٹی پر قبضہ کرنے کی صورت میں کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ کی زمین اس کے بندوں کے لیے بچھی جاتی تھی۔
اس نے بسم اللہ کی، دوست کی مدد سے قرضہ لیا، دو کمروں کا مکان بنانے میں کامیاب ہوا۔ جس میں آدھا کام لکڑی کا تھا۔
شہر کے شور سے دور پہاڑوں کی گود میں ابوذر کا چھوٹا سا محل تیار تھا۔
وہ عائشہ کو چند لوگوں کی موجودگی میں رخصت کرا کے لے آیا۔
وہ خوش تھی حالانکہ اسے اس علاقے سے ڈر لگتا تھا مگر اس نے اکیلے رہ کر اس کا انتظار کرنا سیکھ لیا۔ وہ چھوٹے سے محل کی رانی بن گئی اور اسے چھوٹے سے محل کا راجہ بنادیا۔
دور پہاڑوں میں لکڑی کے محل میں راجہ، رانی نے زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ زندگی پہاڑوں میں رقص کرتی تھی۔
ابوذر کو اب زندگی زندگی لگتی تھی، وہ خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین مرد سمجھنے لگا تھا، جسے ایک کم عمر، خوب صورت لڑکی چاہتی تھی۔ اتنا کہ اس کی پسند کا کھانا بنتا، اس کی پسند کی چیزیں رکھی جاتیں اس گھر میں، اس کی رانی نے اس کے لیے زندگی آسان بلکہ خوش گوار کردی تھی، یہ تھی نئی شروعات اس کی زندگی کی مگر۔

✵ ✵ ✵

بارش بہت زیادہ برس رہی تھی وہ بمشکل دفتر سے گھر پہنچی، بچے پریشان تھے۔ رات بھر اس سے لپٹے رہے۔
"کیا واقعی اس بار سیلاب آئے گا۔" فاطمہ ڈری سہمی اس سے چمٹ کر لیٹی ہوئی تھی۔
"نہیں آئے گا۔" وہ اسے ساتھ لگائے ہوئے اس بوسیدہ چھت کو دیکھ رہی تھی۔
اماں سو چکی تھیں۔ زینی ان کے ساتھ سوئی تھی۔ وہ فاطمہ اور شانی جاگ رہے تھے۔
"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" شانی نے سر اٹھا کر کہا تھا۔
وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ "کیا کہا پھر سے کہنا۔"
"اب اسکول نہیں جاؤں گا۔" وہ ضدی بچے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے کھینچ کر ایک تھپڑ لگایا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ زندگی میں پہلی بار ہاتھ اٹھایا تھا۔
"بولو۔ کیا بولتے ہو۔" وہ چیخی، عجیب وحشت سے۔ فاطمہ کا دل دہل گیا، اماں نیند سے بیدار ہو گئیں۔ "کیا ہوا ہاجرہ! خیریت ہے نا۔"

"کہتا ہے اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"تو تم نے اسے مارا ہے کیا۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ روتے ہوئے شانی کی ہچکی بندھ گئی۔ ساتھ لگالیا نانی نے۔

"آئندہ اگر یہ کہا کہ اسکول نہیں جاؤں گا تو بتاؤں گی اچھی طرح آوارہ پھرنا اپنے باپ کی طرح۔۔۔ اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"اس وقت بچوں پر برس رہی ہو۔ پاگل ہوگئی ہو۔ ارے استغفار پڑھو کیسی بجلی چمک رہی ہے۔" وہ دیر تک بڑبڑاتی رہیں پھر شانی کو ساتھ لگائے ہوئے سو گئیں۔

صبح قریب تھی کہ اس نے شانی کو جاگتے ہوئے پایا' دل بھر آیا۔ اسے اپنے پاس بازو پر لٹالیا۔

"تمہیں پتا ہے بیٹا! میرے پاس کچھ نہیں سوائے تم لوگوں کے۔ بہت خواب دیکھ رکھے ہیں تمہارے حوالے سے۔۔۔ تم نہیں پڑھوگے تو میرے خواب کون پورا کرے گا۔ نوکری مل جائے گی۔ برا وقت گزر جائے گا۔ وقت رکتا نہیں اور برے وقت کے بعد اچھا وقت بھی آئے گا۔"

"ہم پیسے کہاں سے لائیں گے امی۔ اگر نوکری لیٹ ملی۔ پیسے ختم ہوگئے۔ نانی کی دوا نہیں ہے۔ چھت ٹوٹ رہی ہے۔"

"میں زیور بیچ دوں گی۔ میرا زیور تم ہو۔"

"میں آپ کو زیور بیچنے نہیں دوں گا امی!" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر صبر کرو۔۔۔ اچھے وقت کا انتظار۔۔۔ دیکھو' تم میرے بیٹے ہو۔ میرے دوست' میرے ساتھی۔۔۔ تمہیں میرے ساتھ مل کر حالات بہتر بنانے ہیں۔ اس کے لیے مجھے کام کرنا ہے اور تمہیں پڑھنا ہے۔"

"میں پڑھنے کے ساتھ کام بھی تو کرسکتا ہوں نا امی۔"

"کیا کام؟"

"میں ریڑھی لگالوں گا۔۔۔"

اس کا دل ٹوٹ گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔

"آئندہ ایسے نہ کہنا میری جان! تمہاری ماں زندہ ہے ابھی۔ کما سکتی ہے۔ تم کیوں ایسا سوچنے لگے ہو۔"

اور وہ ماں کے سینے سے لگ کر یہ سوچتا رہا کہ جو بچے ریڑھی لگاتے ہیں' پھول بیچتے ہیں' بھیک مانگتے ہیں' ان کی مائیں یہ کیوں نہیں سوچتیں۔ ہر ماں اس کی ماں جیسی کیوں نہیں ہے اور ماں بیٹے کو ساتھ لگائے یہ سوچ رہی تھی کہ سب بچے ایسے ہونے چاہئیں جیسے کہ میرا شانی ہے۔

☆ ☆ ☆

بارش سے جگہ جگہ پانی جمع ہو رہا تھا' ایک طرف رستہ اوپری سطح پر تھا جہاں سے بچے اسکول اور بڑے اپنی اپنی مصروفیات کو نکل رہے تھے۔

ہاجرہ نے برآمدے سے پانی نکالتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا۔ سامنے شانی کھڑا تھا اور رستے سے کچھ لڑکے جو پانی ہٹا رہے تھے' وہ ان کے ساتھ مل کر سڑک صاف کر رہا تھا تاکہ لوگ با آسانی گزر سکیں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور وہ صفائی کرکے جیسے ہلکی پھلکی ہوگئی۔

آج سارا بھی آئی تھی اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اس کے زیور اور اچھے کپڑے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے لے گئی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ دریائے سندھ میں آنے والا پانی کا سیلابی ریلا یہاں بھی اپنے چھینٹے اڑائے گا۔ اس نے ہاجرہ کی بہت منتیں کیں کہ وہ بچوں کو لے کر اس کے گھر شفٹ ہوجائے مگر اس نے ایک نہ مانی۔ وہ چیزیں لے کر چلی گئی۔

ایک دو دن گزر گئے' بارش میں تیزی آرہی تھی اور سیلابی ریلا نزدیک تھا۔

خوف اور وحشت نے ہر جگہ ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ لوگ نقل مکانی کررہے تھے۔ جو نہیں جاسکتے تھے' وہ حفاظتی بچاؤ کرنے لگے۔

اماں کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اتنی کہ کہیں لے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

وہ بچوں کو ماں کے پاس چھوڑ کر دوا لینے کے لیے نکل گئی۔ راستے خراب تھے۔ آدھے گھنٹے کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا' سیلابی ریلا اس علاقے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

ہاجرہ کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگوں کا بھی اندازہ تھا کہ ہو سکتا ہے پانی رخ موڑلے ادھر نہ آئے۔ نیچے بہہ جائے کیونکہ ایک بار وہ بچ بھی چکے تھے۔

اس نے دوالی' سواری ملنا مشکل ہو رہی تھی۔ وہ کافی پیدل چلی پھر رکشہ ملا۔ آدھے رستے پر چھوڑ کر گیا' آگے پانی ہی پانی تھا۔

اس کا دل دہل گیا' دھڑکن جیسے رک گئی' گھر پر کال کر لیتی۔ مگر فون بھی گھر چھوڑ آئی تھی۔ سیلابی ریلا اس کے علاقے میں گھس گیا تھا۔ یہ علاقہ دریا سے قریب تھا۔

اس کی آنکھیں ایسے بہہ رہی تھیں جیسے زمین کی سطح پر پانی پھیل کر بہہ رہا تھا۔

آگے رستہ بند تھا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیں اور کھانے پینے کی اشیا کا تھیلا تھا جو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

اسے صرف گھر کی پروا تھی اور گھر والوں کی۔۔۔

اماں' شانی' فاطمہ' زینی۔۔۔

دل رک گیا جیسے۔ وہ اندھا دھند آگے بھاگی۔ آگے کوئی گڑھا تھا جس میں گر گئی۔۔۔ اٹھنا اور بچنا محال تھا جیسے۔۔۔

☼ ☼ ☼

گھر کی چھت گر گئی تھی' پانی گھس آیا تھا' کون گرا' کون بچا۔ اوسان خطا تھے۔ چیخیں تھیں۔

شانی کے ہاتھ میں نانی کا بازو تھا' وہ اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھیں۔ شانی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ انہیں گھسیٹنے میں کامیاب ہو گیا' مگر تب تک وہ دم توڑ چکی تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر بھاگتے۔ نکلتے لوگوں کو متوجہ کرنے لگا تھا۔

کوئی اس طرف آیا تھا۔ ان دونوں کو گھسیٹ کر آگے کیا۔ جہاں سے پانی کم تھا اور نکلنا شاید کچھ آسان۔ دو افراد نے مل کر اسے اور نانی کو اٹھایا۔ گاڑی میں ڈالا' ان کے سر پر اینٹ گری تھی بہت خون بہہ رہا تھا۔

وہ جیسے بے ہوشی کے قریب تھا۔ زینی اور فاطمہ کو آواز دینا چاہتا تھا مگر حلق میں کچھ پھنسا ہوا تھا جیسے۔

اس کا سر کسی کے کندھے پر ڈھلک گیا تھا۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اسے ہوش نہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی تو اماں اس کے قریب تھی۔ بازوؤں پر چوٹ کے نشان تھے۔ وہ بمشکل آگے آسکی تھی' جہاں سے اسے ماں کی نعش ملی تھی بمشکل اٹھا کر ان کو قریبی علاقے میں اس کے پڑوسیوں نے دفن کیا تھا۔ ان کے کسی گروپ میں فاطمہ بھی زندہ سلامت مل گئی تھی۔ چوٹیں تو اسے بھی بہت آئی تھیں مگر چوٹیں تو بھر جاتی ہیں۔ زینی کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ رو رو کر بچوں کا برا حال ہو گیا تھا' نانی کی موت اور زینی کی جدائی۔۔۔

بس ایک ہی سوال تھا۔ کیا زینی بچ گئی ہو گی۔

کیا وہ ہمیں ملے گی۔

سارا اور سفیر پہنچ گئے تھے۔ گھر لے گئے اسے۔ کچھ دن تک وہ وہیں رہی پھر ایک جگہ کم کرائے پر مکان مل گیا۔

سارا اور سفیر مل کر اپنا کوئی کاروبار شروع کر رہے تھے۔ سارا سڑکوں پر دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی جیسے' اس سیلاب کی نشریات' حادثوں نے جیسے اس کے اندر کی توانائی چھین لی تھی۔

سفیر تو ویسے بھی اس کی وجہ سے ہی پڑا تھا۔ وہ ہاجرہ کو اپنے ساتھ نئے کاروبار میں ملا رہے تھے۔ زندگی معمول پر لوٹنے لگی تھی' مگر اس کی زینی۔۔۔ جس کے ملنے کی آس کبھی دم توڑتی تو کبھی امید کی کرن روشن کرتی۔

آج صبح سارا اور سفیر آئے تھے۔ انہیں مل کر پھر سے کچھ کرنا تھا۔ زینی کو تلاش کرنے کے لیے۔

سفیر کے چہرے پر تھکن تھی، مگر وہ ہشاش بشاش لہجہ لیے اس کے پاس کھڑا تھا سارا نے بچوں کو ساتھ لپٹا کر خوب پیار کیا۔ اب وہ ان کو کہانی سنانے لگی تھی۔

ہاجرہ ناشتے کی ٹرے لے کر ان کے پاس آئی۔ انہوں نے سوچا پھر سے تھانے چلتے ہیں، اخبار میں اشتہار دیتے ہیں۔ شاید کوئی امید پوری اترے۔ وہ تینوں بچوں کو اسکول چھوڑ کر خود نکل گئے اللہ کا نام لے کر۔ وہ نام جو کام بناتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ رات کا پہلا پہر تھا جب سفیر اور سارا گھر کے لیے نکلے تھے اور وہ کھانے کے برتن سمیٹنے لگی تھی، جب دوبار دروازہ بجایا گیا۔

"میں دیکھ لوں ممی!" شانی کمرے سے باہر نکلا تھا۔

"دیکھ لو... مگر دھیان سے۔ پہلے پوچھ لینا کہ کون ہے۔" وہ برتن دھونے لگی تھی۔ شانی کے پیچھے پیچھے قیصر آرہا تھا، شانی عدم دلچسپی دکھاتا ہوا کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کی طرف آیا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

"میں تم سے بات کررہا ہوں۔"

"اپنے مطلب کی بات کرو۔" وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"بچوں سے ملنے آیا ہوں میں... کہاں ہیں میری بیٹیاں۔ بیٹے کو تو تم نے میرے خلاف کردیا ہے۔"

"بہت جلدی نہیں یاد آگئی تمہیں اپنی بیٹیوں کی؟" لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"مجھے تمہاری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فاطمہ، زینی کہاں ہو بچے..." اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ شانی کو کتابوں میں محو پایا۔ فاطمہ بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر اٹھی تھی مگر اس تک آئی نہیں۔

"کیسی ہو بیٹا؟" وہ خود آگے بڑھا۔ اسے پیار کیا۔

"کیا یہ سچ ہے۔ زینی واقعی گم ہوگئی ہے؟" کمرے کے اطراف میں دیکھتے ہوئے جیسے یقین کرنا چاہا۔

فاطمہ نے اثبات میں سرہلایا تھا، اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"تم ٹھیک ہونا۔" اس نے پہلی بار فاطمہ کی اداس آنکھوں میں دیکھا تھا بغور۔ اس کی آنکھیں گہری براؤن تھیں جن میں دکھ اور ڈر ہلکورے لے رہا تھا۔

اس نے فاطمہ کو ساتھ لگالیا۔ "ہم اسے ڈھونڈلیں گے۔ وہ مل جائے گی... زینی ہمیں مل جائے گی۔" وہ زندگی میں پہلی بار فکر مند ہو رہا تھا۔

"شانی... ادھر آؤ... میرے پاس۔" اس نے بازو بڑھا کر اسے قریب کرنا چاہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ سرد تھا، مگر آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ وہ حیرت سے اسے دیکھے گیا۔

"میں تمہارا باپ ہوں شانی! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم میرے پاس آؤ۔" پہلی بار لہجہ شکستہ تھا۔

"اس کی عادت نہیں ڈالی آپ نے۔" وہ کتاب بند کرکے کمرے سے باہر چلا گیا۔

"تم اپنی ماں کی زبان بول رہے ہو۔" اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے فوری طور پر بلوایا گیا تھا، جاتے ہوئے وہ بار بار اسے زینی کے بارے میں تنبیہہ کرتا رہا تھا، پہلے وہ جانے سے پہلے اسے اپنا خیال رکھنے کے لیے کہتا تھا۔ اور نہ جانے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اب تو اسے پکا یقین ہوگیا کہ یہ بچی اس کی بیٹی ہے۔ وہ حیران نہ تھی خائف تھی خفا اور ناراض... اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"مجھے پتا تھا، میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکوں گا... مجھے پتا تھا، تمہیں ایک دن مجھ سے ڈھیر ساری شکایتیں ہوں گی۔" رات اس نے اس کی بات کے جواب میں کہا تھا جب اس نے کہا کہ

"مجھے پتا ہے، تم اپنی پہلی زندگی سے نہیں نکل

پاؤ گے۔ مجھے پتا تھا۔ تم مجھے دل سے نہیں چاہو گے۔۔۔ تمہیں میرا' میری محبت کا' میری سچائی کا کوئی احساس نہیں ہو گا پر میں بے وقوف تھی' احمق تھی۔"

"مجھے پتا تھا' تم بے وقوفیاں کرو گی۔۔۔ تم اب بھی احمق ہو۔ ناسمجھ ہو۔ اکیس بائیس سال اتنی بھی کم عمر نہیں ہوتی مگر تم سولہ سال کی بچیوں کی طرح بی ہیو کرتی ہو۔ بہتر تھا۔۔۔ تم اسی لڑکے سے شادی کر لیتیں۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تم نے کیا کہا ابوذر؟"

"میں نے کہا کہ تمہیں اسی لڑکے سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔۔۔ وہ شاید تمہیں خوش رکھ پاتا۔ بہت پیسہ' بہت پیار۔"

"ایک دفعہ پھر یہ سب کہنا۔۔۔"

"بار بار کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ اتنا کہتا ہوں۔ اب بھی سوچ لو۔ تمہاری زندگی ہے۔۔۔ تم چاہو تو لوٹ سکتی ہو۔ وہاں سب کو انتظار ہے کہ تم لوٹ جاؤ گی۔ تمہارا باپ مجھے تمہیں یہاں رکھنے اور بہت سی ضروریات نہ پوری کرنے کی وجہ سے برا بھلا کہنے لگا ہے۔

تمہاری سوتیلی ماں کو تو کوئی خاص دلچسپی نہیں' مگر وہ بھی میرا نداق اڑاتی ہے۔"

وہ گھڑی پہن کر اس کی طرف مڑا اور کچھ ضروری چیزیں ڈھونڈنے لگا۔

"زندگی بہت لمبی ہے۔ میرے ساتھ نہ رہ پاؤ تو۔۔۔ ابھی فیصلہ کر لو۔"

"یہ سب تم اپنی بیٹی کی وجہ سے کہہ رہے ہو' ہے نا۔"

عورت اپنی محبت میں کتنی کمزور اور بے وقوف بن جاتی ہے یہ وہ بھی نہیں سمجھ پاتی بعض دفعہ۔

"مجھے تم نے۔۔۔ اس بچی نے اور وقت نے احساس دلا دیا ہے کہ مجھے اپنی بچی کو ساتھ رکھنا چاہیے۔ میں چاہوں تو اسے ان محرومیوں سے بچا سکتا ہوں جو میری زندگی میں آئیں' جو میں نے تمہارے اندر دیکھیں۔ میں نہیں چاہتا' میری بیٹی ادھوری زندگی گزارے۔ تم

اگر دل سے قبول کر سکو میری بیٹی کو تو اچھی بات ہے مگر مجھے تم سے کچھ اچھی امید نہیں بہرحال۔۔۔ تم سوچ لو' میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔ ابھی ہماری کوئی اولاد نہیں۔۔۔ ابھی تمہارے لیے پلٹنا شاید آسان ہو۔"

وہ کتنی آسانی سے یہ سب کہہ رہا تھا جو سوچنے کا تصور بھی اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر کا اشتعال بڑھ رہا تھا غصہ بڑھ رہا تھا۔

"تم چاہو تو۔۔۔"

چٹاخ۔۔۔ "اتنی بڑی جرأت" بائیس سالہ لڑکی نے ایک زوردار تھپڑ دے مارا ایک پینتیس سالہ آدمی کو۔

بیوی نے شوہر کا آخری حربہ خود آزمایا جب زبان کسی چیز کو نہیں بیان کر پاتی' سمجھا پاتی' غصہ اور اشتعال بڑھ جاتا ہے تو ہاتھ اٹھتا ہے۔ وہ بلاشبہ غصے کی اتنی ہی تیز تھی مگر۔

وہ حیرانی سے اپنا ہاتھ دیکھنے لگی۔ یہی اٹھا تھا اور اس کے محبوب کا گال دہکا گیا۔ اتنی طاقت۔ ابوذر کے لفظوں نے اسے جتنا دکھ دیا۔ وہ سارا سمیٹ کر اس نے ایک تھپڑ میں اتار دیا۔

وہ چاہتا تو اسے پیٹنا شروع کر دیتا' مگر وہ کم ظرف مرد نہ تھا' درندہ نہ تھا۔ ایک معصوم سی لڑکی کی جرأت پر حیران ضرور تھا' مگر اس نے بدلہ نہیں لیا۔ بیگ کندھے پر ڈالا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ باہر نکلا۔ سیڑھیاں اترتا جا رہا تھا۔

عائشہ نے اپنا سر پٹخنا شروع کر دیا۔ زینی ایک کونے میں کھڑی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے ایک عجیب تماشا دیکھا جو اس نے اپنے گھر میں کبھی اور صورت دیکھا تھا۔ اس کے دل میں بڑوں کا کردار کچھ مشکوک ہو گیا۔ وہ جو کئی دنوں سے نہیں روئی۔ رونا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ امی کو پکارتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر' چیخ چیخ کر رونے لگی اور عائشہ نے اسے خونخوار نظروں سے گھورا تھا اور پھر تھپڑ مار دیا۔ زینی کے رونے میں کمی کے بجائے تیزی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سمیرا نے پہلی بار اسے فون کیا تھا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی یہ بتانے کے لیے نہیں بلکہ یہ کہنے کے لیے کہ اپنی بیٹی کو کچھ دنوں میں آکر لے جانا۔

سمیرا کا لہجہ نرم تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے باپ نہیں چھیننا چاہتی۔ ابوذر نے بڑی خاموشی سے اس کی بات سنی اور جب اس کی بات ختم ہوئی تو بغیر الوداعیہ کلمات کہے اس نے فون بند کر دیا۔

اس کے چہرے پر ایک تکلیف دہ مسکراہٹ پھیل گئی' اسے پتا تھا سمیرا کے شوہر نے بچی کو ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ سمیرا اتنی آسانی سے کہاں بچی اس کے حوالے کرنے والی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی دوبارہ اپنے طریقے سے شروع کرنے جا رہی تھی۔

اس نے سوچا' وہ فیلڈ سے فارغ ہو کر ایک دو دن میں اپنی بیٹی سے ملنے جائے گا۔ اس کے لیے ڈھیر سارے کھلونے لے جائے گا۔ اس کے لیے طرح طرح کی چیزیں لے جائے گا کھانے کی۔ اس کے لیے اچھے والے کپڑے خریدے گا۔ یہ سوچ کر ہی اس کی مسکراہٹ سے تکلیف غائب ہونے لگی تھی۔

اس نے سوچتے ہوئے اخبار اٹھایا سرسری نظر گزرتے ہوئے پلٹی اور پلٹ کر ٹھہر گئی۔

یہ تصویر زینی کی تھی۔ اطلاع گمشدگی کے ساتھ نیچے کانٹیکٹ نمبر بھی دیے گئے تھے۔ وہ فوراً" متوجہ ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کتنا زہر بھر دیا ہے تم نے میرے بچوں کے دل میں میرے خلاف۔" وہ صبح چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے زہر بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"افسوس کہ مجھے ایسا کچھ کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی نہ ہی ضرورت پڑی تم نے خود ہی اپنے عمل' اپنے رویے' اپنی ظالمانہ فطرت سے ان کے اندر یہ زہر کا بیج بو دیا۔ جسے کئی سال ہو چکے ہیں۔ اور اب تمہیں احساس ہو رہا ہے کہ تمہارے بچے تم سے نفرت کرتے ہیں۔ انہیں تم سے نفرت ہی کرنی چاہیے۔ کتنی دیر میں اپنی اہلیت اور اصلیت کھلی ہے تم پر مگر کھل بہرحال گئی۔"

اس نے ایک عرصہ اس شخص سے دبتے جھجکتے' اس کا لحاظ کرتے ہوئے گزارا تھا۔ اب اس کے اندر رتی برابر اس کے لیے ــــ نہ نرمی تھی نہ گنجائش۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے دھکے دے کر نکال دیتی' مگر وہ بچوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی' نہ ہی اپنی پریشانیوں کو بڑھانا چاہتی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ بہت برا کیا ہے۔ بدلہ لے رہی ہو مجھ سے۔" وہ زور سے چیخا تھا۔

شانی کمرے سے باہر آیا۔ "آپ میری ماں سے لڑ رہے ہیں۔" وہ ان دونوں کے بیچ کے فاصلے میں آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں تمہارا باپ ہوں شانی!" اس کا لہجہ کچھ دھیما پڑا۔

"مجھے پتا ہے۔" شانی کا لہجہ دھیما مگر کاٹ دار تھا۔

"تم طنز کر رہے ہو۔ اپنے باپ پر۔ کس قدر بگاڑ دیا ہے تم لوگوں کو تمہاری ماں نے۔"

"ممی۔ اندر چلیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوا۔

"مجھ سے بات کرو شانی! بتاؤ کیا کہتی رہتی ہے یہ عورت تم لوگوں کو۔ بتاؤ کتنا ورغلاتی ہے اپنے باپ کے خلاف۔ بولو۔ بولو نا۔" اس نے شانی کا بازو پکڑ کر پاگلوں کی طرح کہا تھا۔

"چھوڑو میرے بیٹے کو۔ کوئی حق نہیں ہے تمہیں اسے ہراساں کرنے کا۔" اس نے بازو چھڑایا۔

شانی اس کے پیچھے جا چھپا تھا۔

"ممی! یہ مجھے ماریں گے۔" شانی کو اس کی وحشت سے ڈر لگ رہا تھا۔

"میرے سامنے' میرے ہوتے ہوئے کوئی یہ جرأت نہیں کر سکتا۔"

"اچھا ہوا' میں نے تم پر بھروسا نہیں کیا۔ اچھا ہوا' میں نے تمہیں اس قابل نہیں سمجھا۔ تم تھیں ہی اس قابل۔ نفرت کرتا ہوں میں تم سے۔"

"تم اگر ہماری زندگیوں کو پھر سے تباہ کرنے آئے ہو تو چلے جاؤ۔ بجائے غم بانٹنے کے، تمہیں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں۔"

وہ خاموشی سے کمرے کی طرف گیا۔

"بہت کوشش کی تھی کہ ان کے دل پر تمہارے خلاف کوئی اثر نہ پڑے، بہت کوشش کی کہ یہ تمہارے لیے اچھا سوچیں، مگر تم نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ یہ تم پر ڈیپنڈ نہیں ہیں، اس لیے ان کو ہراساں کرنے کا سوچنا بھی نا۔" وہ کچن سے باہر نکل گئی دروازے پر بیل ہو رہی تھی۔ وہ ہونٹ چبانے لگا۔ لفظوں کے کھلاڑی کے پاس جوابی لفظ کمزور پڑ گئے تھے۔ دروازہ کھلنے پر سارا اور سفیر اندر آئے تھے۔ سفیر نے اس کو سلام کر کے حال احوال پوچھا تھا، وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو نا سفیر!" اس کے چہرے پر یقین اور بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ وہ سفیر سے بات کر رہی تھی۔

"ہاں، میں سچ کہہ رہا ہوں یقین کرو تم، مجھے کچھ دیر پہلے ہی فون آیا ہے وہ آدمی اپنا نام ابوذر بتاتا ہے اور اس نے اخبار دیکھا ہے۔ وہ بتا رہا تھا۔ اسی علاقے کا جہاں سے یہ کیمپ لگائے گئے تھے۔ اسے وہیں سے زینی ملی تھی۔"

"اف خدایا!" ہاجرہ کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"سفیر! میں نفل پڑھ لوں شکرانے کے۔" اس کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

"پڑھ لینا میڈم! مگر ابھی چلیں خاصا دور ہے وہ علاقہ۔"

"ہاں چلو۔ جلدی چلو۔ میں تسبیح تو لے لوں سفیر۔"

وہ کمرے کی طرف بڑھی۔

سارا کمرے میں گھسے بچوں کو باہر لائی تھی۔ بچے اس سے خوشی سے چمٹے ہوئے تھے۔

اس سب میں وہ کتنا اجنبی لگ رہا تھا، اس نے پہلی بار یہ سب محسوس کیا تھا۔

"ہم بھی چلیں گے۔" فاطمہ اور شانی کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

"ضرور چلیں گے۔ جلدی چلو۔ راستے میں ناشتا لے لیں گے۔ مجھے پتا ہے، تم نے ناشتا نہیں کیا ہوگا۔"

وہ شانی کو ساتھ لگائے اس کے بال بگاڑتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔ شانی اس سے چمٹا ہوا اس کا بازو تھامے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ پوچھ رہا تھا۔ کبھی اس نے بیٹے کو یوں لپٹا کر نہ پیار کیا تھا نہ ہی وہ اس طرح لاڈ کرتا تھا۔ وہ لوگ عجلت میں باہر نکلے۔ سارا نے اسے بھی کہہ دیا تھا ساتھ چلنے کو مگر وہ ان سب کو ایک ساتھ خوش دیکھ کر مزید جلنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے گھر بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا۔

شانی، سفیر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سارا ہاجرہ اور فاطمہ پیچھے بیٹھے تھے۔ وہ گھر کے بیرونی دروازے کے ساتھ کھڑا دل جلا رہا تھا۔ گاڑی آگے بڑھنے کے بعد اس نے بڑے غصے سے دروازہ بند کیا اور دروازے کی پشت پر مکا جڑ دیا، جس سے دروازے کو تو کوئی فرق نہیں پڑا مگر اس کا ہاتھ لوہے کے دروازے سے ٹکرا کر جیسے سن ہو گیا تھا جس پر اس کے چہرے کا تاثر دیکھنے لائق تھا۔

☆ ☆ ☆

ابوذر خلاف توقع تیزی سے آ رہا تھا۔ کل ہی تو وہ گیا تھا۔ وہ جی بھر کر حیران ہو رہی تھی اور کچھ ڈری ہوئی۔

"زینی۔ زینی کہاں ہو بچے!" وہ ایک سے دوسرے کمرے میں جھانک کر آوازیں دینے لگا پھر لاؤنج، کچن ہر جگہ واش روم میں بھی دیکھ آیا۔ کمرے کے دروازے، کونے درزیں جیسے کوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ ساتھ ہی وہ آوازیں بھی دیے جا رہا تھا۔

"کہاں ہے زینی۔" وہ پاگلوں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تو اس کے پیچھے آیا۔

"مجھے کیا پتا۔" مری سی آواز نکلی۔

"کیا مطلب۔ تمہیں کیا پتا۔ اس کے گھر والے اسے لینے آ رہے ہیں۔ پہنچنے والے ہوں گے۔" وہ بوکھلا گیا اس کے انداز پر۔

"وہ۔ واقعی تمہاری بیٹی نہیں تھی؟"

"عائشہ!" اس کا جی چاہا اسے پیٹنا شروع کردے۔ "کہاں ہے وہ۔ بتاؤ۔ کہاں ہے۔ کیا کیا ہے اس کے ساتھ۔" وہ اس کے آگے بڑھتے ہی دیوار سے جا لگی تھی۔

"مم۔ میں کیوں ماروں گی اسے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ قسم کھاتی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس تھپڑ مارا تھا۔"

"کیا۔ تم نے اسے مارا۔" یہ بھول گیا کہ تھپڑ تو وہ اس کو بھی مار بیٹھی تھی۔ چھوٹی سی بچی کو مارنا کیا دشوار تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ عائشہ نے آنکھیں بھینچ لیں پھر اس کا رکتا ہاتھ دیکھ کر کھولیں۔

"سچ سچ بتاؤ۔ اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ سچ بتاؤ۔ تھپڑ نہیں ماروں گا۔ گلا دبا دوں گا۔ بتاؤ۔" وہ اس کے گرد دیوار پر ہاتھ جمائے کھڑا دھاڑا تھا۔

"مم۔ مجھے واقعی نہیں پتا۔ وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"دیکھو اگر اسے کچھ ہوا۔ وہ نہیں ملی۔ کچھ بھی۔ کوئی نقصان بھی تو میں تمہیں اس کے ماں باپ کے حوالے کروں گا۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔ پھر جیل بھجوا دوں گا۔"

اس کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ عائشہ نے پھر سے آنکھیں بھینچ لیں۔

"وہ۔ وہ نیچے گئی تھی۔ اسے ڈھونڈ لیتے۔ ہیں۔"

وہ فوراً نیچے کی طرف آیا' جب تک سفید کرولا روڈ پر کھڑی تھی اور اس میں سے کچھ لوگ اتر کر ادھر ہی آرہے تھے۔ وہ وہیں سیڑھیوں کے بیچ رکا رہ گیا۔ پھر اوپر آیا۔

"وہ آگئے ہیں وہ لوگ۔ آرہے ہیں ادھر۔ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ بات کرنا خود ہی۔ کتنا ظلم کیا ہے تم نے ایک معصوم بچی پر اور کہاں چھوڑ آئی ہو۔ ایف آئی آر کٹے گی تم پر۔" وہ مزید کہتا مگر قدموں کی آواز سیڑھیوں سے اوپر آرہی تھی۔

"السلام علیکم۔ مسٹر ـــ!" سفیر اسے سامنے دیکھ کر آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھایا۔

"وعلیکم السلام۔ میں ابوذر۔" اس نے ہاتھ فوراً تھام کر چھوڑ دیا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے ہمیں اطلاع دی۔ ہم آپ کا احسان کیسے اتاریں' بتائیں۔" سفیر متاثر کن انداز میں کہنے لگا۔

"زینی کہاں ہے۔" ہاجرہ آگے بڑھی اور ارد گرد دیکھنے لگی۔

"وہ۔ وہ یہیں تھی۔ یہ اس کی چیزیں۔ کپڑے۔" اس نے اس کے اسکارف کی طرف اشارہ کیا جو لاؤنج میں سامنے ہی کھونٹی پر لٹکا تھا۔

"پر وہ ہے کہاں۔ اسے پتا ہے ہم آگئے ہیں۔" سارا آگے بڑھی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ جو خالی نظر آرہا تھا۔ دوسرے میں عائشہ بت بنی کھڑی تھی۔

"ادھر آؤ۔" ابوذر نے اسے آواز دی کڑک دار لہجے میں۔

وہ کانپتی ہوئی باہر آئی۔

"وہ تھی یہاں۔ رات بھی۔ مگر وہ۔ اصل میں۔ وہ شور کرتی تھی' روتی تھی' ضد بھی کرتی تھی۔"

"وہ ہے کہاں؟" ہاجرہ جیسے رو دینے کو تھی۔

"وہ غصے میں پتا نہیں کہاں۔ کہیں نیچے' شاید یہیں کہیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" کہتے ہوئے آواز کانپی تھی۔

"کیا مذاق ہے یہ۔" سارا کا لہجہ تلخ تھا۔

"دیکھیے' میں اسے ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا کل۔ یقین کریں۔" ابوذر بھی بوکھلایا ہوا تھا۔ اور ہاجرہ نے شانی کو تھام لیا تھا۔ شانی اور فاطمہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔

"دیکھیے ابوذر صاحب! ہمیں صرف اپنی بچی چاہیے۔" سفیر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"دیکھیں میں' ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں ناواقف ہوں۔ ورنہ میں آپ کو اطلاع کیوں دیتا۔ دیکھیں' وہ یہیں کہیں ہو گی۔ ہم ڈھونڈتے ہیں۔ مل جائے

گی۔ ایک رات میں وہ کہاں جاسکتی ہے بھلا۔"

"ہاجرہ! بچوں کو لے کر رکو یہیں ہم آتے ہیں۔" سفیر نے ابوذر کو ساتھ چلنے کا کہتے ہوئے پھر اس سے کہا۔

"میں ساتھ چلوں گی۔ میری زینی۔" اس کی آواز بھرآگئی۔

"نہیں، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم رکو۔ ہم آتے ہیں۔"

سارا بچوں کو لے کر اندر آگئی۔ اور بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر انہیں پانی پلایا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ مل جائے گی۔ اوکے۔" وہ بچوں کو سمجھا رہی تھی۔

بچوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

✵ ✵ ✵

نہر کے کنارے ایک سوئٹر ملا تھا۔ ابوذر چونکا تھا۔

"یہ تو اس نے پہن رکھا تھا۔"

"ابوذر صاحب! ہم پولیس کو کال کرتے ہیں۔" سفیر نے موبائل اٹھایا اور نمبر ملانے لگا۔ تب ہی ہاجرہ چیخی۔

"وہ۔ وہ کیا ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح آگے بڑھی، جہاں سے پتھر پر کوئی چھوٹا سا اسکارف لہرا رہا تھا۔ وہ تینوں اس سمت بڑھے۔ بڑے پتھر کے نیچے وہ گری تھی۔ کانپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔

سفیر نے اسے فوراً اٹھالیا۔ ہاجرہ چمٹ گئی۔ زینی بخار میں تپ رہی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر ماں کو بے یقینی سے دیکھا اور ہاجرہ نے اس کا سر چوم لیا۔ گلے سے لگالیا۔

"بچی کو لے چلیں۔ بہت ٹھنڈی ہوا ہے۔" ابوذر کا جیسے اکھڑا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔

سفیر نے اسے گاڑی میں لٹایا اور سارا اور بچوں کو بلانے گیا۔

"دیکھیے، آپ کھانا وغیرہ کھا کر جائیے سفیر صاحب!" ابوذر اس کے ساتھ اوپر آیا۔

"نہیں بہت شکریہ ابوذر! ہمیں بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔ وہ بخار میں تپ رہی ہے۔ آپ کا شکریہ۔

چلو سارا!"

"زینی مل گئی؟" وہ اٹھی اسے دیکھ کر۔

"ہاں مل گئی ہے گاڑی میں ہے، چلو بیٹے دھیان سے۔" وہ تینوں آگے بڑھے۔

"سفیر! وہ ٹھیک ہے نا۔" سارا کو بے چینی تھی۔

"تم نیچے جاؤ، ہاجرہ اکیلی ہے۔ بخار ہے اسے۔" وہ بچوں کو لیے نیچے اترنے لگی۔

"میں آپ سے بات کروں گا ابوذر صاحب! آپ کو کچھ پیسے وغیرہ یا پھر۔"

"کچھ نہیں سفیر صاحب! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں خود ایک بیٹی کا باپ ہوں۔" ابوذر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

"اوکے بہت شکریہ۔ ملیں گے پھر بات ہوگی۔" وہ ہاتھ ملا کر اللہ حافظ کہہ کر نیچے چلا گیا۔ اس کے پہنچتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی۔ ابوذر ریلنگ پر جھکا تھا۔

"بچ گئیں تم۔ شکر کرو۔ ورنہ۔ یقین آگیا تمہیں کہ وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ میری بیٹی سمجھ کر بتا نہیں تم نے اس پر کتنے ظلم ڈھائے ہوں گے۔ شرم آنی چاہیے۔ ایک بچی پر۔ کیسے احساس ہوگا۔ اپنی اولاد۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

عائشہ اسے دیکھتی رہی، دل چاہ رہا تھا۔ یہیں سے کود کر جان دے دے۔ شرمندگی کا کیسا عالم تھا۔

✵ ✵ ✵

وہ لوگ رات گئے گھر لوٹے تھے۔ وہ گھر سے باہر ہی نہیں گیا، البتہ وہ چھ گھنٹے سوتا رہا اور کچھ دیر پہلے ہی اٹھا تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ اب باہر جائے، مگر تب تک وہ لوگ آچکے تھے، یہ کوئی رات نو بجے تک کا وقت تھا۔

"زینی کیسی ہو۔" وہ آگے بڑھا اسے بانہوں میں

اٹھانا چاہا۔

"آپ ہمیں چھوڑ کر نئی آنٹی کے ساتھ چلے گئے تھے۔" زینی کے اس سے کئی شکوے تھے۔ پہلی بار وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"آپ پھر ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے؟" وہ اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔

سفیر اور سارا ہاجرہ کے ساتھ کھڑے تھے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا۔ زینی وقفے وقفے سے سفیر سے چاکلیٹ یا کسی چیز کی فرمائش کر رہی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ان کے لیے چیزیں لایا کرتا تھا۔

"بخار اُتر جائے تو لاؤں گا۔ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پہلے۔"

"زینی میں تمہارے لیے چاکلیٹ لاؤں؟" قیصر نے بڑی حسرت سے کہا تھا۔

"آپ تو نہیں لاتے۔ انکل لاتے ہیں۔" اس کی بات پر قیصر کا چہرہ اُتر سا گیا۔

"اب لاؤں گا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ رات ساڑھے گیارہ بارہ تک وہ لوگ چلے گئے۔ بچے سو گئے تھے دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔

قیصر کا فون بجنے لگا۔ وہ باہر آیا بات کرنے کے لیے۔ اس کی بیوی کا فون تھا۔

ہاجرہ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی' اسے دیکھ کر وہ زیادہ بات نہ کر سکا۔ ہوں ہاں میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔

ہاجرہ خاموشی سے بچوں کے کمرے میں چلی گئی۔ قیصر کا بستر دوسرے کمرے میں لگایا گیا تھا۔ وہ بچوں کے کمرے میں آیا' جہاں ہاجرہ اپنا بستر بچھا رہی تھی بچوں کے بستر کے ساتھ۔

"میں اپنے بچوں کے ساتھ سونا چاہتا ہوں۔" وہ اس سے بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے باہر آیا۔ "تم بھی سو سکتی ہو یہاں پر۔"

"میرا گھر ہے' مجھے پتا ہے مجھے کہاں سونا ہے۔" وہ دوسرے کمرے کی طرف گئی۔

"تم بیوی ہو میری۔" اس کا لہجہ جتانے والا تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو گیا اس کے جاتے ہی وہ بند دروازے کے سامنے کھڑا بند دروازے کا مفہوم سوچ رہا تھا۔

اسے کون بتاتا کہ دوسروں کی راہیں بند کرنے اور ان پر زندگی تنگ کرنے والوں کو دروازے ہمیشہ بند ملتے ہیں پھر یہ ان پر ہے کہ وہ لوٹ جائیں یا بند دروازے پیٹتے رہیں۔

☼ ☼ ☼

سیمرا کی شادی ہو گئی تھی' اس کا شوہر اسے اپنے ساتھ مسقط لے گیا تھا جہاں ان کی رہائش اور کاروبار تھا۔

ابوذر بہت سارے کھلونے اور ڈھیر ساری چیزیں لے کر اپنی بیٹی کو لینے گیا تھا اور اسے اپنے چھوٹے سے لکڑی کے محل میں لے آیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ آہستہ آہستہ عائشہ اسے قبول کر لے گی۔ اس کی بیٹی بہت پیاری تھی۔ وہ شرارتیں نہیں کرتی تھی نہ شور کرتی نہ تنگ کرتی۔ وہ بات بھی بہت کم کرتی تھی شاید اس کی تربیت میں شامل احساس کمتری اسے پوری طرح اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

ابوذر اس کے ساتھ بہت وقت گزارتا تھا' وہ عائشہ کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ عائشہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے اب بے وقوفیاں کرنی کم کر دی تھیں۔

اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ ابوذر کی بیٹی کو اب اس کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ وہ چاہے بھی تو کچھ نہیں کر سکتی۔ عائشہ کا رویہ بچی سے بہت اچھا نہ تھا تو برا بھی نہ تھا۔ ابوذر اتنے پہ ہی مطمئن تھا۔ کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے' وہ دکھوں سے' مشکلوں سے' پریشانیوں سے گزرنا ہے۔ اس نے بہت ساری باتوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔

اسے گزرتے وقت نے بتایا کہ کوئی پریشان حال ایسا

نہیں ہے۔ جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ ہر بے چارے کا یہاں کوئی نہ کوئی چارہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری بیوی میں اگر کوئی عیب ہے تو تمہیں یہ سوچ کر اسے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ سوچو کہ تم میں بھی کچھ عیب ہوں گے۔ یا پھر تم خود کو بے عیب سمجھتے ہو۔ کیونکہ تم نے کبھی آئینے میں اپنا اصل چہرہ نہیں دیکھا۔ یا پھر آئینے نے تم سے خاص رعایت رکھی۔"

ہاجرہ بہت دنوں بعد اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کر رہی تھی۔

چار دن یہاں ٹک کر اس نے ہاجرہ کو دیکھا تو اسے زندگی کے کٹھن ہونے کا احساس ہوا تھا وہ احساس بعض اوقات جھنجھوڑ دیتا ہے۔ ہلا دیتا ہے۔

وہ اسے کولہو کے بیل کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے حساس بچوں کو دیکھتا تو نہال ہو جاتا، مگر یہ سب محنت اس کی بیوی کی تھی اس میں اس کا کوئی ہاتھ نہ تھا' اس لیے وہ خوش ہو سکتا تھا مگر فخر نہیں کر سکتا تھا۔

وہ خود سے شرمندہ رہنے لگا تھا۔ اس نے وہاں جانا چھوڑ دیا' جہاں اس کی محبوبہ رہتی تھی۔ ایک دن ہاجرہ نے اس کا فون ریسیو کیا اور بات سنی۔ وہ رو رہی تھی۔

"تم ایک سیلفشں مرد کے لیے رو رہی ہو۔ ایک ایسے مرد کے لیے جو تمہاری خاطر اپنے بچوں کو چھوڑ سکتا ہے تو تمہیں چھوڑنا اس کے لیے کیا مشکل ہو گا۔ تمہیں رونا نہیں چاہیے۔"

پھر اس نے ہاجرہ کو بتایا کہ اس میں ایک کمی ہے' وہ بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ پہلے شوہر نے بھی اسی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سوچا اب قیصر کے ساتھ وہ نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ ہاجرہ نے اسے علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ اسے جاب کرنے کا کہا اور اس کی ہمت بندھائی۔ اس کے بعد وہ پہلی بار قیصر سے خود مخاطب ہوئی اتنے روز میں۔

"میں اب اپنے بچوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

"میں اکیلے رہنے کی عادی ہو گئی ہوں قیصر! بچوں کی وجہ سے میں تمہارے ساتھ ایک گھر میں رہنے کے لیے تیار ہوں مگر بحیثیت اپنے بچوں کی ماں' اس سے زیادہ مجھ سے امید مت رکھنا۔"

"ہم نئے سرے سے زندگی نہیں شروع کر سکتے ہاجرہ!" اس بار وہ ہنس سکی نہ مسکرا سکی۔

"میرے دل میں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے اب جیسے مرے ہوئے لوگ زندہ نہیں ہو سکتے' ویسے مرے ہوئے ساتھ کا بھی زندہ ہونا مشکل ہے۔ میں تم سے نفرت نہیں کرتی۔ تمہارے لیے اتنا کافی ہونا چاہیے۔" وہ مسکرا کر اٹھ گئی۔

بچے خوش تھے کہ ان کے ماں باپ ان کے ساتھ ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ زندگی شاید اب اتنی مشکل نہیں۔

قیصر نے اپنی زمین بیچ کر ایک پلاٹ خریدا تھا۔ وہ اب اس پر آہستہ آہستہ تعمیر کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ اب کمانا چاہتا تھا۔ اسے محنت کرنا تھی۔ ساری زندگی زمینوں سے آتا منافع کھاتا رہا اپنی ضروریات پوری کرتا رہا مگر اب محنت سے کمانا چاہتا تھا۔

قیصر اچھا شوہر نہ بن سکا مگر وہ اب کوشش کر رہا تھا کہ ایک اچھا باپ بن جائے۔ وہ محنت کر رہا تھا جو کہ مشکل ہوتی ہے' وہ اس بند دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا' مگر اس کی چابی وہ کھو چکا تھا۔

جیسے استغفار کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں اسی طرح مسلسل آواز دینے سے کبھی کوئی لوٹ بھی آتا ہے اور دروازہ کھل بھی جاتا ہے۔